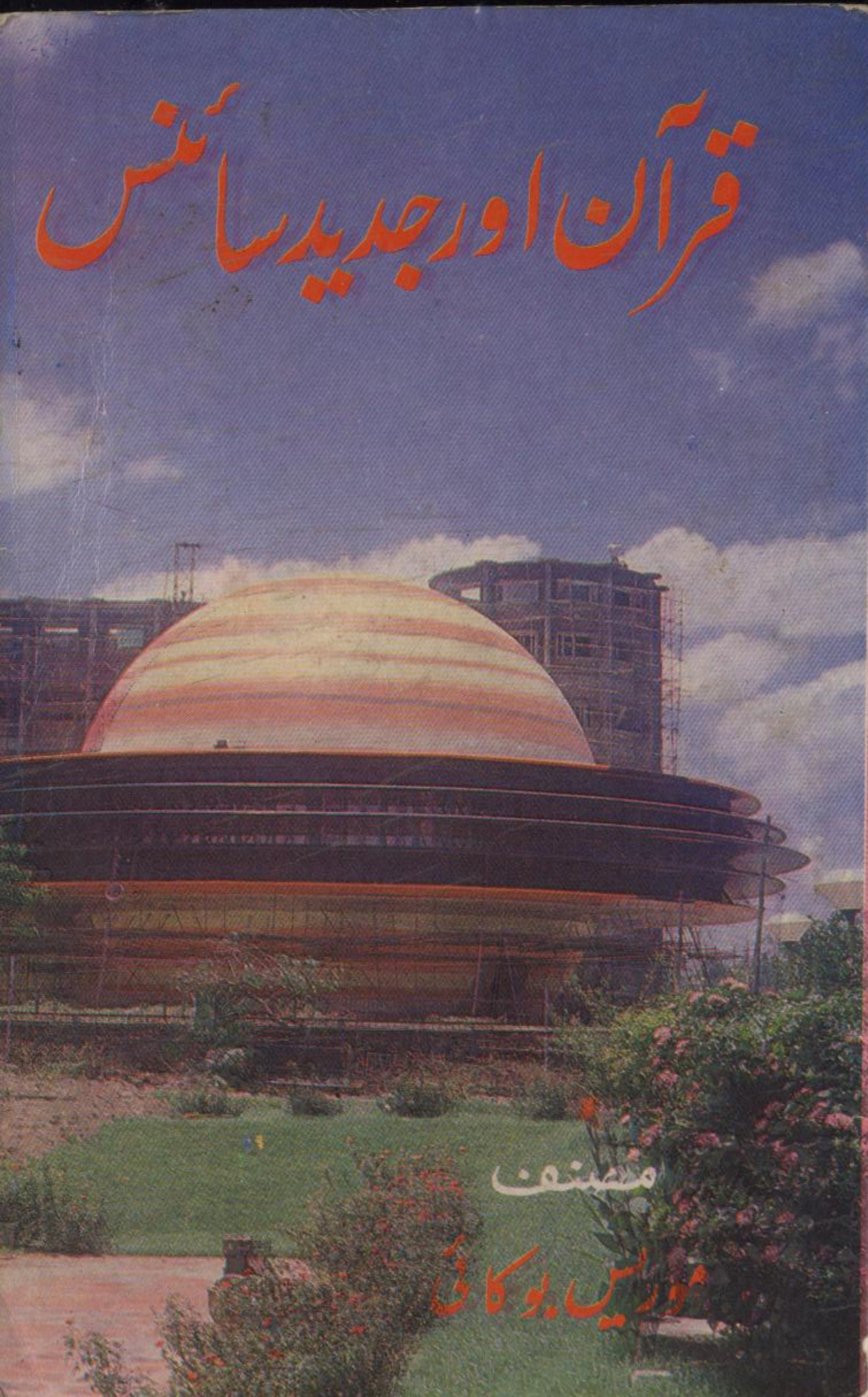
قرآن اور جدید سائنس



مصنف

موریس بوکائی

نام کتاب : ——— قرآن اور جدید سائنس
مولف : ——— مورس بوکائی
مترجم : ——— حیدر علی مولجی طاؒ
سنہ طباعت : ——— نومبر ۱۹۹۴ء
مطبوعہ : ——— نظامی آفسیٹ پریس، لکھنؤ
تعداد : ——— ایک ہزار (۱۰۰۰)
سرورق : ——— عباس حسنین
ناشر : ——— عباسؑ بک ایجنسی
قیمت : ——— تیس روپئے Rs 30/=

قرآن کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد

"اللہ کی کتاب تمہارے سامنے کھل کر بولنے والی ہے۔ اس کی زبان کہیں لڑکھڑاتی نہیں۔ ایسا گھر ہے جس کے کھمبے سرنگوں نہیں ہوتے۔ ایسی عزت ہے کہ اس کے معاون شکست نہیں کھاتے۔ یہ اس حکمت کی طرح ہے جو قلب مردہ کے لیے حیات، اندھی آنکھوں کے لیے بینائی، بہرے کانوں کے لیے شنوائی اور تشنہ کاموں کے لیے سیرابی ہے اور اسی میں جملہ سامان کفایت و حفاظت ہے۔ اس کے کچھ حصے کچھ حصوں کی وضاحت کرتے ہیں اور بعض، بعض کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔
یہ ذات الٰہی سے متعلق الگ الگ نظریے پیش نہیں کرتی۔"

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۳۱)

ملنے کا پتہ : عباس بُک ایجنسی، درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ

عرض ناشر

قرآن مجید وہ انمول موتی ہے جو غیب کے خزانے میں مکنون و مستور تھا۔ وہ نایاب گوہر ہے جسے ازل ہی سے جوہر شناس نظریں ایمان کے بازار میں تلاش کر رہی تھیں۔ یہ علوم کا مخزن، معارف کا سرچشمہ، تہذیب و تمدن اور شائستگی کا محور ہے تو حسن اخلاق، نفس کشی اور حق پرستی کا مصدر بھی ہے۔ یہ جس طرح ایک عزلت گزیں فقیر کے ترک و آداب اور فقر کا معلم ہے اسی طرح ایک شہنشاہ کی جہانگیری، عدل و انصاف، رعایا پروری، دادگستری اور نیک نامی کا اتالیق بھی ہے۔ یقیناً اس کے اسرار و رموز، معانی و مطالب اور علوم و فنون قابل غور اور لائق توجہ ہیں۔

یہ وہ آسمانی کتاب ہے جس میں خدا کی ذات و صفات، عبادت کے طور و طریقوں، اخلاقیات، احکامات، معاملات، اصلاحی امور، عبرت، نصیحت دنیا و آخرت اور ہر خشک و تر کا تذکرہ موجود ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے: وَمَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ "ہم نے قرآن میں کوئی چیز اٹھا نہیں رکھی"۔ اسی کی شان میں ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ "ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا بیان ہے"۔ اسی کتاب کے بارے میں ہے کہ "اگر تمام انس و جن اجتماعی قوت سے اس قرآن کا مثل پیش کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں پیش کر سکتے"۔ اسی کے بارے میں امام حسن علیہ السلام کا قول ہے کہ "خدا نے

ایک سو چار کتابیں نازل کیں اور ان سب کتابوں کے جملہ علوم توریت، زبور اور انجیل میں ودیعت رکھے اور پھر ان تینوں کتابوں کے علوم بھی قرآن ہی کے سپرد کر دیے۔

اس امر میں شک نہیں کہ قرآنی لغات کے ضابطے، کلمات کی تحریر، حروف کے مخارج کی معرفت اور اس کے آیات، سوروں، ٹکڑوں، ربع، نصف، اور ثلث کے شمار، منازل، سجدات، وقف، وصل، مد، ادغام وغیرہ کے لحاظ سے کچھ لوگ علم قرأت و تجوید کے مالک بنے، اسی کے کلمات، اسمار، افعال، مشتقات وغیرہ سے علم کا پھریرا لہرایا۔ اسی کے معانی، معرب و مبنی، حروف عاملہ و غیر عاملہ، لازم و متعدی اور فاعل و مفعول کا تجزیہ کر کے لوگ علم صرف و نحو کی سلطنت کے حکمراں ہوئے۔ اسی کے عموم، خصوص، اشتراک، ترادف، حقیقت اور مجاز وغیرہ پر نظر کر کے لوگ علم لغت کے تاجدار ہوئے۔ اسی کے شواہد عقلیہ، اصلیہ اور نظریہ کی بدولت علم اصول دین (علم کلام) مستنبط ہوا۔ اسی کی تعمیم، تخصیص، نص ظاہری، مجمل، محکم، متشابہ وغیرہ سے علم اصولِ فقہ ماخوذ ہوا۔ اسی کے عبرت آمیز واقعات، حالات و قصص اور آثار سے عرب و عجم میں علم تاریخ کی بنیاد پڑی۔ اسی کی مثالوں، حکمتوں، مواعظ، وعد، وعید، تحذیر، تبشیر، ذکر موت و حیات، معاد، نشر و حشر، حساب و کتاب اور جنت و جہنم کی بدولت خطیبوں اور واعظوں کا وجود عمل میں آیا۔ اسی کے خواب، حکم اور امتثال سے علم تعبیر کی بنیاد پڑی۔ اسی کے ذکر لیل و نہار، شمس و قمر، نجوم و منازل اور بروج وغیرہ سے اوقات کا تعین اور علوم افلاک کا در کھلا۔ اسی کے الفاظ اور معانی و مطالب پر غور و فکر کرنے سے اربابِ بصیرت اور اصحاب حقیقت پر ایسے رموز آشکار ہوئے کہ انھیں فنا،

بقا، خوف، ہیبت، وحشت، محبت، قبض اور بسط وغیرہ کا استنباط ہوا۔ اسی سے متضاد کیفیتوں کے تفاعل سے مزاج کے اعتدال، نظام صحت اور استحکام قوت سے علم الطب کے اصل اصول کی طرف لطیف اشاروں اور خرابی کے بعد صحت کی درستی، بیماری کے بعد جسم کی توانائی نیز طب اجسام کے علاوہ طب قلوب کے لیے بہترین تلمیحات و کنایات کا پتہ چلا۔ اسی قرآن میں ملکوتیت، ارض و سماوات، علوم علوی و سفلی کے تذکرے بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی میں علم ہیئت، ریاضی اور علم ہندسہ کا ذکر ہے۔ اسی میں علم مناظرہ و جدول کا بیان۔ اسی میں امم سابقہ کی مدت، سال اور ایام اور دنیا کے گزشتہ و آئندہ تواریخ کا ذکر اور پھر ان میں باہم ایک دوسرے کے ساتھ ضرب دینے سے علم جبر و مقابلہ کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اسی میں تجارت، فلاحت، عمارت، نجارت، ملاحت، کتابت، قصارت اور حجارت کا سبق بھی ملتا ہے۔

غرض کہ کوئی علم، کوئی فن ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی انداز سے اس کتاب میں مذکور نہ ہو۔ اس میں نہ صرف اللہ، نہ صرف غیر اللہ بلکہ تمام متعلقات کا تذکرہ ہے۔ پھر ایسی کتاب کے مطالب پر حاوی ہونا بشری قوت سے باہر، اس کے مسائل کا احاطہ کرنا انسانی طاقت سے بعید نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

قرآن کے رموز و اسرار، تفاسیر اور معنی و مطالب کا صحیح علم صرف اللہ، اس کے رسولؐ اور آل رسولؐ سے وابستہ ہے جو قرآن کے وارث اور نزول قرآن کے حامل و مشاہد ہیں۔ عام انسانوں کی عقلیں اس کے بعض اسرار و رموز سے عاجز و قاصر ہیں۔ علماء اور مفسرین نے اپنے اپنے انداز سے اپنے علم کے دائرے میں محدود رہ کر قرآنی تفاسیر پر قلم فرسائی کی ہے

اور وہی اثاثہ آج ہمارے درمیان کتابی صورت میں موجود ہے۔

کچھ اہلِ قلم حضرات نے آج کے سائنسی دور میں قرآن کو جدید نظروں سے بھی دیکھا ہے اور اس کا تجزیہ سائنس کی روشنی میں بھی کیا ہے۔ مصنف موریس بوکائی کی کتاب "قرآن اور جدید سائنس" اسی تجزیہ کی مرہونِ منت ہے جس کا ترجمہ علی حیدر مولجی طٰہٰ کے قلم سے ہوا ہے اور یہ کتاب کراچی پاکستان سے شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے اور قارئین کے لیے دل چسپی کا باعث اور سود مند ثابت ہوئی ہے۔

اس حقیقت کو پھر واضح کر دوں کہ عباسؑ بک ایجنسی کا بنیادی مقصد چیدہ اہل قلم حضرات کی تصنیفات و تالیفات کو منظر عام پر لانا اور ان کے علمی کارناموں سے عوام کو روشناس کرانا ہے تاکہ علم کسی ایک جگہ محدود نہ رہے۔

اس کتاب کی اشاعت سے قبل ہم نے مولانا ڈاکٹر سید کلب صادق صاحب کی کتاب "قرآن اور سائنس" کو منظر عام پر لانے کا اعلان کیا تھا لیکن مولانا کی بے پناہ مشغولیت و مصروفیت کی وجہ سے وہ کتاب ابھی تک سامنے نہ آسکی۔ بہرحال ہماری کوشش ہے کہ وہ کتاب بھی منظر عام پر جلد آجائے تاکہ ہمارا وعدہ سرخرو ہو سکے۔

زیر نظر کتاب "قرآن اور جدید سائنس" کیسی ہے؟ کیا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ خود کریں اور اپنی رائے سے ہمیں مطلع کریں تاکہ اشاعت کا ہر اقدام آپ کی مرضی کے مطابق ہو سکے۔

سید علی عباس طباطبائی
عباسؑ بک ایجنسی، درگاہ حضرت عباسؑ
رستم نگر لکھنؤ ۳

فہرست

قرآن اور جدید سائنس

تعارف

قرآن اور سائنس کا باہمی تعلق حیرت انگیز ہے، خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تعلق موافقت اور ہم آہنگی کا ہے نہ کہ ناموافقت اور اختلاف کا۔

ایک مذہبی کتاب (قرآن) اور جدید سائنس سے غیر مذہبی تصورات کا باہمی آمنا سامنا شاید آج کل بہت سے لوگوں کو ایک مہمل اور متناقص بات معلوم ہو۔ چند مستثنیات سے قطع نظر جدید سائنسدانوں کی اکثریت مادی نظریات پر ایمان رکھتی ہے اور مذہبی مسائل سے بے اعتنائی برتتی ہے بلکہ انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے کیونکہ ان کے خیال میں ان کی حیثیت قصص و روایات اور خرافات کی سی ہے۔ مزید برآں جب اہلِ مغرب سائنس اور مذہب پر گفتگو کرتے ہیں تو یہودیت اور عیسائیت کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن اسلام کا انھیں کبھی خیال نہیں آتا۔ دراصل اسلام کے بارے میں غلط تصورات کی بنا پر اس قدر غلط اور باطل رائیں قائم کی جا چکی ہیں کہ آج اسلام کی حقیقت کا ایک صحیح تصور قائم کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

اسلامی وحی وتنزیل اور سائنس کے تقابلی مطالعے کی تمہید کے طور پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جو مغربی دنیا میں بہت غیر معروف ہے، کا ایک مختصر سا خاکہ یہاں پیش کیا جائے۔

مغربی ممالک میں اسلام کے بارے میں جو سراسر غلط بیانات دیئے جاتے ہیں وہ بعض دفعہ جہالت اور لاعلمی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور بعض دفعہ اسلام کو بدنام کرنے اور اس کی گھناؤنی تصویر کشی کی منظم کوششوں کا نتیجہ۔ لیکن سب سے زیادہ سنگین غلط بیانیاں وہ ہیں جو حقائق اسلام کے متعلق کی جاتی ہیں کیونکہ غلط فہمی پر مبنی آرا و خیالات تو قابلِ معافی

ہیں لیکن حقائق واقعی کو غلط رنگ میں پیش کرنا قابلِ معافی نہیں۔ جب بظاہر ضروری استعداد اہلیت کے حامل مصنفین کی ممتاز اور وقیع تصانیف میں اسلام کے متعلق کھلے جھوٹ پڑھنے میں آتے ہیں تو طبیعت میں اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ یہاں انسائیکلوپیڈیا یونیورسلز (Encyclopaedia universalis) کی چھٹی جلد سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ اناجیل (Gospels) کے زیرِ عنوان مصنف قرآن اور اناجیل کے اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "انجیلوں کے مصنف

"انجیلوں کے مصنف (.....) قرآن کے برعکس یہ دعویٰ نہیں کرتے (.....) کہ وہ ایک ایسی سوانح عمری لوگوں تک پہنچا رہے ہیں جو خدا نے معجزانہ طور پر پیغمبر کو لکھوائی....."

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو کسی سوانح عمری سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو سراسر دعوت و تبلیغ ہے، وعظ و نصیحت ہے۔ اگر مصنف نے قرآن کے کسی معمولی سے معمولی ترجمے کا بھی مطالعہ کیا ہوتا تو یہ بات اس پر واضح ہو جاتی۔ محولہ بالا بیان حقیقت سے اتنا ہی بعید ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ انجیل اپنے مصنف کی سوانحِ حیات بیان کرتی ہے۔ قرآن کے متعلق اس فحش غلط بیانی کا ذمہ دار ایک ایسا شخص ہے جو لیون میں جیسوئٹ فیکلٹی آف تھیالوجی (یسوعی شعبۂ دینیات) کا پروفیسر ہے۔ اس نوع کی کذب بیانیوں سے لوگوں میں قرآن اور اسلام کے بارے میں ایک غلط تاثر پیدا ہوتا ہے۔

چونکہ اب مذاہب بند جھیلوں کی طرح نہیں رہے کہ اپنے پیروؤں تک ہی محدود ہوں جیسا کہ پہلے ہوا کرتے تھے اور باہمی افہام و تفہیم کی کوششیں بھی کی جا رہی ہیں اس لیے امید کی جا سکتی ہے کہ کذب و افترا، غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی یہ فضا زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی۔ یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ رومن کیتھولک چرچ کی اعلیٰ ترین سطح پر مسلمانوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چرچ مذکور اسلام کو صحیح رنگ میں سمجھنے اور اس کے متعلق عام رائج غلط خیالات و تصورات کو بدلنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔

اس کتاب کے تعارف میں، میں نے اس عظیم تبدیلی کا ذکر کیا ہے جو گزشتہ چند سالوں میں رونما ہوئی ہے۔ میں نے ویٹیکن کے، غیر عیسائی امور کے دفتر کی تیار کردہ ایک دستاویز موسومہ "عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان افہام و تفہیم کی گفتگو کی سمت کا تعین" (Orientation for a dialogue between Christians and Muslims) کا حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک بہت اہم دستاویز ہے کیونکہ یہ اسلام کے متعلق اختیار کردہ نئے موقف کو ظاہر کرتی ہے۔ جیسا کہ اس دستاویز کے تیسرے ایڈیشن (۱۹۷۰ء) میں ہم پڑھتے ہیں "نیا موقف ہم سے اسلام کے بارے میں اپنے رویے پر نظرِ ثانی اور تعصبات کا تنقیدی جائزہ لینے کا تقاضا کرتا ہے..." "ہمیں سب سے پہلے اسلام کے متعلق اپنے عیسائی بھائیوں کے نقطۂ نظر کو بتدریج بدلنا ہوگا۔ یہ بات سب سے ضروری ہے"..... اسلام کے متعلق تعصبات اور بہتانوں سے مسخ شدہ جو فرسودہ اور جاہلانہ تصور ہمیں ماضی سے ورثے میں ملا ہے، ضروری ہے کہ اسے خیرباد کہا جائے"..... اور مسلمانوں سے ماضی میں جو ناانصافی کی گئی ہے اس کا اعتراف کریں کیونکہ اپنی عیسائی تعلیم کی بنا پر مغرب اس ناانصافی کے لیے قابلِ الزام ٹھہرتا ہے[1]۔

مذکورہ ویٹیکانی دستاویز ۱۵۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس میں اسلام کے متعلق

---

[1] تاریخ کے ایک خاص دور میں اسلام دشمنی خواہ وہ کسی بھی رنگ اور شکل میں ہو اور خواہ کلیسا کے علاوہ دشمنوں ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو کیتھولک کلیسا کے اعلیٰ عہدیدار اسے انتہائی پسندیدگی اور خوشنودی کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ پوپ بینڈکٹ چہاردہم جسے اٹھارہویں صدی کا سب سے بڑا عیسائی پیشوا یا پاپائے اعظم خیال کیا جاتا ہے، اس نے فرانسیسی مصنف والٹیر کو بلا ہچکچاہٹ اپنی دعا اور برکت سے نوازا (حالانکہ والٹیر اپنی مذہب دشمنی کے لیے مشہور تھا)۔ یہ اس بات کے شکریے کے طور پر تھا کہ والٹیر نے اپنا المیہ ڈرامہ "محمد یا کٹرپن" (Mahomet ou le fanatisme) مطبوعہ ۱۷۴۱ء کو پوپ موصوف سے منسوب کیا تھا۔ یہ ڈرامہ کیا تھا ایک فحش اور غیر مہذبانہ ہجو تھی اور کوئی بھی چالاک بد مذہب قلم گھسنے والا کسی بھی موضوع پر لکھ سکتا تھا۔ برے آغاز کے باوجود اس ڈرامے کو خاصی شہرت حاصل ہوئی اور اسے کامیڈی فرانکائے کے تماشوں کے ذخیرے میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح اس کی اہمیت کو قومی سطح پر تسلیم کر لیا گیا۔

عیسائیوں کے پرانے خیالات کی تردید کی گئی ہے اور اصل حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ "ہمیں اپنے بدترین تعصبات سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے" کے زیرِ عنوان لکھتے ہوئے مصنف نے عیسائیوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ "اس بارے میں بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے رویے کی اصلاح و تطہیر کریں۔ خاص کر ان بندھے ٹکے فیصلوں اور خیالات کی اصلاح بہت ضروری ہے جو اکثر بڑے ہی سرسری اور ادیبانہ طریقے سے اسلام کے متعلق ظاہر کیے جاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس قسم کے غلط اور مطلق العنانہ خیالات کو ہم خفیہ طور پر بھی اپنے دلوں میں جگہ نہ دیں جو مسلمانوں کے لیے الجھن اور برہمی کا باعث ہوں۔"

اس قسم کا ایک بے حد اہم نقطۂ نظر یا رویہ وہ ہے جو جس کے تحت عیسائی حضرات بار بار 'اللہ' کا لفظ استعمال کر کے اس سے 'مسلمانوں کا خدا' مراد لیتے ہیں جیسے کہ مسلمان کسی ایسے خدا کو مانتے ہوں جو عیسائیوں کے خدا سے مختلف ہے۔ اللہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب قابلِ پرستش ہستی یعنی خدائے واحد (گاڈ) ہی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک اللہ موسیٰ اور عیسیٰؑ کے گاڈ یعنی خدا کے سوا اور کچھ نہیں۔[1]

ویٹیکن کے غیر عیسائی امور کے دفتر نے جو دستاویز تیار کی ہے اس میں اس بنیادی نقطہ پر حسبِ ذیل الفاظ میں زور دیا گیا ہے:

"اس پر اصرار کرنا، جیسا کہ مغرب میں کچھ لوگ کرتے ہیں کہ اللہ دراصل گاڈ (خدا) کا ہم معنی نہیں بلکہ اس سے مختلف ہے، ایک بے معنی بات ہے۔ مختلف نظریوں کو ملانے اور متحد کرنے کے مقصد سے تیار کردہ تحقیقی دستاویزوں نے اسی دعوے کی قلعی کھول کر اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ 'گاڈ' (خدا) میں اسلامی اعتقاد و ایمان کی وضاحت کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ یہاں لیومن جنیٹم (Lumen Gentium)[2] سے اقتباس

---

[1] گاڈ انگریزی گاڈ اور فارسی خدا بھی متحد الاصل ہیں۔ اور خدا مسلمان عام بولتے ہیں۔ (مترجم)

[2] یہ ایک دستاویز کا عنوان ہے جو دوسری ویٹیکن کونسل (۶۵-۱۹۶۲ء) نے تیار کی۔

دیے جائیں: مسلمان دینِ ابراہیم پر ایمان رکھتے ہیں اور ہماری ہی طرح خدائے واحد و رحیم کی عبادت کرتے ہیں، یعنی وہ خدا جو قیامت کے دن انسانوں کی عدالت کرے گا اور جزا و سزا دے گا۔۔۔۔"

اس لیے یورپی زبانوں میں جب اسلام کے حوالے سے اکثر "گاڈ" کی بجائے "اللہ" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس پر مسلمانوں کا احتجاج کرنا سمجھ میں آتا ہے۔۔۔ تعلیم یافتہ اور مہذب مسلمانوں نے ڈی میسون کے فرانسیسی ترجمۂ قرآن کی تعریف کی ہے کیونکہ اس نے اس میں 'اللہ' کی بجائے کم سے کم 'دیو' (Dieu)[3] تو لکھا ہے۔

ویٹیکانی دستاویز میں کہا گیا ہے کہ:

"صرف اللہ ہی ایک لفظ ہے جو عربی بولنے والے عیسائی 'گاڈ' (خدا) کے لیے استعمال کرتے ہیں۔"

مسلمان اور عیسائی خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ آگے چل کر ویٹیکن دستاویز میں اسلام کے متعلق کیے گئے غلط فیصلوں اور اندازوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

اسلامی عقیدۂ قضا و قدر کے بارے میں بہت غلط تعصبات اور تصورات پائے جاتے ہیں۔ مذکورہ دستاویز میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے اور قرآن سے تائیدی حوالے دے کر اس کے مقابلے میں انسانی ذمے داری کا تصور اجاگر کیا گیا ہے کہ اخروی جزا و سزا کا دار و مدار انسان کے دنیاوی اعمال پر ہو گا۔[4] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں اسلام کے بجائے

---

[3] یہی لفظ انگریزی میں ڈیٹی (Deity) بن گیا ہے۔ مطلب ہے برتر و بالا ہستی خدا۔ فرانسیسی کا 'دیو' سنسکرت اور ہندی میں بھی موجود ہے۔ فارسی میں بھی 'دیو' ہے مگر برے معنی میں، عفریت، شیطان وہیں سے اس معنی میں اردو میں بھی آگیا۔ مترجم۔

[4] سورۂ زلزال (پارہ ۳۰) کی آخری آیات میں فرمایا گیا ہے کہ "جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی وہ اسے (حساب کے دن) دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی وہ اسے دیکھ لے گا۔" یہ ہے انسانی مسئولیت کا قرآنی تصور۔ جہاں تک قضا و قدر کی فلسفیانہ بحثوں کا تعلق ہے۔ رسول اکرمؐ نے اس سے منع فرمایا کہ یہ عملی کو راہ دیتی اور گمراہ کن ہیں۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ جبریہ، قدریہ، مرجیہ وغیرہ فرقے انہی بحثوں مناظروں کے نتائج میں پیدا ہوئے اور اسلام کے لیے باعث نقصان ہوئے۔ غیروں کے علاوہ خود اکثر مسلمانوں نے تقدیر کے معنی غلط سمجھے اور بقول اقبال "عمل سے غافل ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ" (مترجم)

بالعمل کے عقیدے اور شریعت پرستی کے متعلق جو تصور رائج ہے وہ غلط ہے۔ دستاویز مذکور میں قرآن کے دو فقروں کا حوالہ دیا گیا ہے جن کا مطلب مغرب میں بہت غلط سمجھا گیا ہے اور ان کی وساطت سے اخلاص عقیدے کو شریعت پرستی یا نجات بالعمل کے مقابل کے مقابل رکھا گیا ہے۔ وہ فقرے یہ ہیں:

۱۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲: ۲۵۶)

(ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔)

۲۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲: ۷۸)

(ترجمہ: اور (اللہ نے) دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔)

مغرب میں اسلام کے متعلق عام تصور یہ ہے کہ وہ 'مذہب خوف' ہے۔ لیکن مذکورہ دستاویز میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام 'مذہب محبت' ہے یعنی ایمان باللہ کی بنیاد پر اپنے ہمسائیوں سے محبت کرنے اور حسن سلوک سے پیش آنے کا مذہب۔ اس میں اس غلط تصور کی تردید کی گئی ہے کہ اسلام میں نظام اخلاق نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح بہت سے یہودیوں اور عیسائیوں میں جو عام خیال پایا جاتا ہے کہ اسلام تعصب اور کٹرپن کا مذہب ہے اسے بھی رد کیا گیا ہے۔ اس بارے میں دستاویز میں حسب ذیل تبصرہ کیا گیا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ اپنی تاریخ کے دوران میں اسلام نے اس سے زیادہ تعصب و تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا جتنا کہ عیسائیوں نے ہر دفعہ کیا جب بھی عیسائی مذہب کو سیاسی اہمیت و قوت حاصل ہوئی۔"

اس موقع پر دستاویز کے مصنفین نے قرآن کے حوالے یہ ثابت کرنے کے لیے دیئے ہیں کہ مغرب میں 'جہاد' کا مطلب اور ترجمہ غلط سمجھا اور کیا گیا ہے۔[۱] "عربی میں الجہاد فی سبیل اللہ

---

[۱] مغربی مترجمین قرآن اپنے ترجموں میں ایسے مطالب و معانی ڈال دینے کی غیر مذہبی 'دنیادارانہ' عادت سے پیچھا چھڑا سکے جو عربی متن میں نہیں پائے جاتے۔ بے شک متن میں کوئی تبدیلی کیے بغیر اس پر سرخیاں قائم کی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے الفاظ ہیں۔ جن کا مطلب ہے اللہ کی راہ میں سعی وجہد۔" اسلام کو پھیلانے اور اسے حملہ آوروں سے بچانے کی کوشش' مذکورہ ویٹیکانی دستاویز میں مزید کہا گیا ہے کہ:

"جہاد کا مطلب وہ ہرگز نہیں جو بائبل میں 'خیریم' (Kherem) کا ہے۔ جہاد سے مخالفوں کی تباہی اور بیخ کنی مقصود نہیں بلکہ خدا اور انسان کے حقوق کو دوسرے ممالک تک پہنچانا اور پھیلانا ہے۔

ماضی میں جہاد کے دوران میں جو تشدد ہوا وہ عام طور پر قوانین جنگ کے تتبع میں تھا مزید براں صلیبی جنگوں کے دوران میں مسلمان اپنے مخالفوں سے بڑھ کر قتل و غارت کے مرتکب نہیں ہوئے۔"[۲]

بقیہ حاشیہ

جا سکتی ہیں لیکن سرخی کے اضافے سے عام مطلب و معنی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً آر۔ بلاشیر (R. Blachere) کا فرانسیسی ترجمہ قرآن (مطبوعہ پیرس' ۱۹۶۶ء) مشہور و معروف ہے' اس کے صفحہ ۱۱۵ پر اس نے یہ سرخی دی ہے جو قرآن میں نہیں پائی جاتی: "فرض جہاد" یہ سرخی ایک ایسی عبارت کے آغاز میں دی گئی ہے جس میں مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانے کی دعوت دی گئی ہے لیکن اس عبارت کی نوعیت وہ نہیں جو سرخی کے ذریعے اس پر تھوپ دی گئی ہے۔ لہٰذا جس شخص کی رسائی قرآن تک صرف تراجم کے ذریعے ہے۔ وہ یہ سرخی پڑھ کر لامحالہ یہی خیال کرے گا کہ مسلمان پر جہاد فرض ہے۔ (مصنف)

[۲] اہل مغرب کے ذہنوں میں اسلامی جہاد کا تصور بڑا خوفناک قسم کا ہے اور سراسر دانستہ یا نادانستہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جہاد کا اولین حکم سورۂ حج کی آیہ ۳۹ میں اس وقت دفاعی جنگ کے طور پر دیا گیا جب کمزور اور بے سہارا مسلمانوں پر دشمنوں کا ظلم و تشدد حد سے بڑھ گیا۔ ارشادِ خداوندی ہوا کہ "جن لوگوں (مسلمانوں) پر ظلم کیا گیا ہے انھیں (اپنے دفاع میں) لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ (مظلوم) وہ لوگ ہیں جنھیں ان کے گھروں سے اس لیے ناحق طور پر نکال دیا گیا کہ وہ کہتے تھے ہمارا پروردگار اللہ ہے۔" اس کے بعد سورہ البقرہ کی آیہ ۱۹۰ میں حکم ہوا کہ "تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" ظاہر ہے کہ یہ دفاعی جنگ کا حکم ہے جارحیت کا نہیں۔ سورۂ نسا کی آیہ ۷۵ میں فرمایا گیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ تم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶) اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبے گئے ہیں اور فریاد کر رہے کہ اے خدا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔" جہاد کا مادہ جہد ہے۔ اس کا مطلب حصول مقصد کے لیے اپنی انتہائی سعی و جہد کرنا اور اپنے تمام وسائل اور تدابیر کو بروئے کار لانا اور رنگ و دو کرنا ہے۔ راہِ خدا میں ہتھیاروں سے جنگ کرنا جہاد کا صرف ایک پہلو ہے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں اور بعد ازاں خصوصاً صلیبی جنگوں کے دوران میں مسلمانوں کی جو مڈبھیڑ عیسائیوں سے ہوئی وہ اپنے دفاع اور اللہ کی راہ میں قتال و جہاد تھا۔ صلیبی جنگوں کے بعد اسلامی جہاد اہلِ مغرب کے دل و دماغ پر ایک ہوا بن کر چھا گیا جس سے وہ اب تک نجات حاصل نہیں کر سکے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا انجیل میں فرمان ہے کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دے یعنی جنگ و مقابلہ نہ کر۔ لیکن عیسائیت کے علمبرداروں نے کبھی بھی اس پر عمل نہیں کیا۔ اگر مغرب اپنی مادی اغراض اور استعماری مقاصد کے لیے تلواروں، توپوں، ٹینکوں اور ایٹم بموں سے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو ہلاک کر دے اور شہر کے شہر پیوند زمین کر دے تو بجا لیکن اگر مسلمان اپنے دین، جان و مال، عزت و آبرو کے دفاع میں ہتھیار اٹھائیں تو وہ ظالمانہ اور جارحانہ ٹھہرے اور شور مچا دیا جائے کہ ع

"بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے انسانوں سے

چونکہ اسلام نے خدائے واحد کی بندگی کے سوا انسان کو ہر قسم کی بندگی سے نجات کی نوید سنائی تھی۔ قیصر و کسریٰ کی صدیوں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے کا اعلان کیا، اس لیے لا الٰہ الا اللہ کے اعلان کو ظالم و جابر مطلق العنان حکمرانوں نے اپنے لیے خطرہ سمجھا اور مخالفت پر اتر آئے۔ یہ مخالفت مزید شدت اختیار کر گئی جب مدینہ میں پہلی اسلامی مملکت قائم ہو گئی جس کی ابتدائی نوعیت یونان کی شہری ریاستوں کی سی تھی۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں اس نئے دین اور نئی مملکت کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر روم اور ایران کی سلطنتوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں ان دونوں سلطنتوں سے جو آویزش ہوئی اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اس کی بنیادی وجہ یہی تھی، قرآن فتنہ و فساد کو قتل سے بڑھ کر اور بدتر قرار دیتا ہے۔ فتنے کا سدباب کرنے کے لیے پہلے مخالفوں کو اسلام کی دعوت دی گئی اور انکار کی صورت میں اپنے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دین پر رہتے ہوئے جزیہ دینے کی اس دوسری صورت میں وہ اسلامی حکومت کی حفاظت و پناہ میں ہوں گے اور انھیں تمام انسانی شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ البتہ اگر وہ اسلامی افواج میں رضا و رغبت سے بلا جبر و اکراہ شامل ہو کر دشمنان اسلام کے خلاف جنگ کریں تو جزیہ معاف ہو گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اگر کبھی مسلمان ذمیوں کی حفاظت نہ کر سکے تو وصول کردہ ٹیکس بھی واپس کر دیا گیا۔

چونکہ شام، فلسطین، مصر، ایشائے کوچک، شمالی افریقہ، اسپین وغیرہ میں عیسائیوں سے جہاد کیا گیا، اس لیے عیسائیوں نے جہاد کو غلط اور بھیانک رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ جہاد و قتال کا مقصد فتنہ و فساد کی روک تھام ہے جیسا کہ سورۃ انفال کی آیت ۳۹ میں فرمایا گیا کہ "تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے اور دین خالصۃً اللہ ہی کے لیے ہو جائے (اور اسی کا آئین نافذ ہو)
جہاد کا خوف اہلِ مغرب کے دلوں میں اس قدر جاگزیں ہو چکا تھا کہ گزشتہ صدی میں ایران میں علی محمد باب کو انگریزوں نے آلۂ کار بنایا اور برصغیر پاکستان و ہند میں مرزا غلام احمد قادیانی کو۔ اور ان سے یہ فتوے جاری کرائے کہ موجودہ زمانے میں جہاد بالسیف یعنی اسلحے کے ذریعے جہاد منسوخ ہو گیا۔ صرف قلمی جہاد باقی ہے علامہ اقبال مرحوم نے بڑے طنز اور دلسوزی سے لکھا ہے

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام
کس کی ہیبت سے ہے یہ فرمانِ جدید
ہے جہاد اس عہد میں مردِ مسلماں پر حرام

سر ولیم میور نے اپنی مشہور تصنیف "خلافت اور اس کا عروج و زوال" (Caliphate, its rise, decline and fall) کے آخر میں ایک باب میں لکھا تھا کہ دنیا میں اسلام نے جہاد کے نام پر جس قدر خونریزی کی کسی اور نے نہیں کی۔ لیکن پہلی عالمی جنگ کے بعد جب اس کتاب کا نیا ایڈیشن نکلا تو یہ باب اس میں سے حذف کر دیا گیا۔ اس لیے کہ اہلِ مغرب کی اس ایک جنگ نے دنیا بھر میں خونریزی کے اگلے پچھلے ریکارڈ مات کر دیئے اور پھر دوسری عالمی جنگ میں جو خونریزی دین عیسیٰ کے پیروؤں اور انسانی تہذیب کے علمبرداروں نے کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وہ پہلی عالمی جنگ کی خونریزی تباہی اور بربادی سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم مہذب اور عیسائی امریکہ ہی نے برسائے دوسری عالمی جنگ کے بعد کوریا، ویت نام اور اب افغانستان تک خونریزی اور بربادی کے ذمہ دار بھی مغرب کی مہذب اور نام نہاد آزادی کی علمبردار سپرپاورز ہیں۔ یہ جو ایٹم بموں، ہائیڈروجن بموں، بین البراعظمی میزائلوں، راکٹوں، ایٹمی آبدوزوں وغیرہ کی دن رات تیاری جاری ہے اور ان کے ڈھیر لگائے جا رہے ہیں آخر کس لیے؟ کیا پیغمبر امن عیسیٰ کی تعلیم پر عمل کرنے کے لیے؟

کلائیو بیل نے اپنی مشہور تصنیف 'تہذیب' (Civilization) میں لکھا ہے کہ ۱۹۰۵ء سے پہلے اہل مغرب جاپان کو ایک نہایت وحشی اور پسماندہ ملک سمجھتے تھے لیکن جب ۱۹۰۵ء میں جاپان نے یورپ کی عظیم و قدیم سلطنت روس کو بری طرح شکست دی تو سارا یورپ اور امریکہ یک لخت جاگ اٹھا اور پکار اٹھا کہ "او ہو! جاپان تو ایک بڑا ہی مہذب ملک ہے" مطلب یہ کہ جو اہل مغرب کی ٹھکائی کر سکے اور انھیں شکست دے سکے وہ مہذب ہے۔ چونکہ مسلمان ابھی اس پوزیشن میں نہیں اس لیے جہاد کے خطرے کا سدباب اہل مغرب کے نزدیک ضروری ہے۔ جہاد کا مطلب مسلمان کی خودی کی بیداری ہے جس سے اہل مغرب خائف ہیں۔ اس لیے جہاد برا ہے۔

یہاں جہاد پر کوئی مفصل اور جامع نوٹ لکھنا مقصود نہ تھا۔ اس موضوع پر عمدہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ صرف اہل مغرب کی تیاری کی طرف توجہ مبذول کرانا تھی۔

آخر میں مشہور مصری مصنف سید قطب شہید کی تصنیف "معالم فی الطریق" کے انگریزی ترجمے 'Milestone' (جادہ و منزل' کے نام سے اس کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے) کے چوتھے باب "جہاد فی سبیل اللہ" سے ایک مختصر سا اقتباس دینا بے محل نہ ہوگا۔

"یہ (جہاد) ظلم و استبداد کو ختم کرنے اور بنی نوع انسان کو بھی آزادی سے ہمکنار کرنے کی تحریک تھی جس میں انسانوں کی واقعی صورت حال کو مد نظر رکھ کر وسائل و ذرائع کو استعمال کیا گیا۔ اس کے واضح اور متعین مراحل تھے اور ہر مرحلے پر مختلف طریقے استعمال کیے گئے۔ ... اگر جہاد کو دفاعی تحریک کہنے پر اصرار کیا جائے تو دفاع کا مطلب یہ ہوگا کہ آزادی کو محدود کر دینے والے تمام عناصر کے خلاف (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مذکورہ ویٹیکانی دستاویز کے آخر میں اہل مغرب کے اس اندھے تعصب سے بحث کی گئی ہے جس کے مطابق "اسلام ایک تنگ خیال، تنگ نظر مذہب ہے جو اپنے پیروؤں کو ازمنۂ وسطیٰ کی فرسودہ و پسماندہ حالت میں رکھتا ہے اور انھیں جدید دور کی تکنیکی فتوحات کے قابل نہیں بناتا۔" دستاویز میں عیسائی ممالک میں جہاں اس سے ملتی جلتی صورت حالات مشاہدے میں آئی ہے، اس کا موازنہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "اسلامی فکر کے روایتی پھیلاؤ میں ہمیں شہری معاشرے کے ممکنہ ارتقا کا ایک اصول ملتا ہے۔"

مجھے یقین ہے کہ ویٹیکن کی طرف سے اسلام کے اس دفاع سے بہت سے خدا پرستوں کو حیرت ہوگی خواہ وہ مسلمان ہوں، یہودی ہوں یا عیسائی ہوں۔ یہ خلوص اور بے تعصبی کا ایک ایسا مظاہرہ ہے جو ماضی سے ورثے میں ملے ہوئے فکری رویے سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو کیتھولک چرچ کے اعلیٰ ترین ارباب اختیار کے اس نئے رویے سے آگاہ ہوں۔

اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد ان کارروائیوں پر نسبتاً کم حیرت ہوتی ہے جو عیسائیت اور اسلام کے درمیان اس صلح اور ملاپ کا باعث ہوئیں۔ پہلے تو ویٹیکن میں غیر عیسائی امور کے شعبے کے صدر سعودی عرب کے شاہ فیصل سے سرکاری طور پر ملاقات کے لیے گئے۔ پھر ۱۹۷۴ء کے دوران میں پوپ پال ششم نے سعودی عرب کے علمائے عظام کا سرکاری طور پر استقبال

انسان کی حفاظت کی جائے، یہ عناصر اعتقادات و تصورات بھی ہو سکتے ہیں، معاشیات اور نسلی امتیازات پر مبنی سیاسی نظامات بھی"۔ . . .

دفاع کے یہ معنی لینے سے ہمیں اسلام کی صحیح خصوصیت سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ اسلام نوع انسان کی آزادی کا اعلان ہے کوئی انسان دوسرے انسانوں کو غلام بنا کر نہیں رکھ سکتا۔ کائنات پر صرف ایک خدا کی حکمرانی ہے۔ انسان کے غرور و تکبر اور خود غرضی کا خاتمہ ہونا ضروری ہے اور انسانی معاملات میں شریعت الٰہیہ کا نفاذ ہونا چاہیے۔" (حاشیہ ختم)

کیا اس کے بعد بشپ ایچنجر (Elechinger) نے علمائے عظام کا جوسٹرابرگ کے بڑے
گرجا میں استقبال کیا اور انھیں گرجا کے سماع خانہ (Choir) میں عبادت کرنے کی
دعوت دی، اس کی روحانی اہمیت بہتر طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔ چنانچہ علمائے عظام نے عشائے
ربانی کی میز (Altar) کے سامنے مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔[1]

اس طرح اسلامی اور عیسائی دنیاؤں کے نمائندے جو ایک خدا پر ایمان رکھتے اور
باہمی اختلاف رائے کا احترام کرتے ہیں۔ اعلیٰ ترین سطح پر گفت و شنید کرنے پر متفق
ہو گئے ہیں۔ ان حالات پر قدرتی بات ہے کہ ان کی الہامی کتابوں کے دوسرے پہلو
کو آمنے سامنے لایا جائے اور سائنسی معلومات نیز ان کے متون کی صداقت یا عدم صداقت
کے متعلق حاصل شدہ علم کی روشنی میں ان کی جانچ پرکھ کی جائے۔ جس طرح ہم نے یہودیوں
اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ کی جانچ پرکھ کی ہے، اسی طرح اب قرآن پر نظر غائر ڈالیں گے

مذہب اور سائنس کا باہمی رشتہ کسی بھی جگہ کسی بھی زمانے میں ہمیشہ یکساں نہیں
رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی توحید پرست مذہب کے کسی بھی نوشتے میں سائنس کی مذمت
نہیں کی گئی لیکن اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ بعض معتقدات کے مذہبی حکام کے ساتھ
سائنسدانوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ عالم عیسائیت میں صدہا سال تک مذہبی
حکام نے سائنسی ترقی کی مخالفت کی۔ انھوں نے مستند و مصدقہ مذہبی کتابوں کے حوالے
سے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنے طور پر ایسا کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ سائنس کو وسعت و ترقی دینے والوں
کے خلاف کیسے کیسے اقدامات کیے گئے جن کی بنا پر سائنسدانوں کو ملک بدر ہونا پڑا تا کہ زندہ
جلا دیئے جانے سے بچ سکیں۔ البتہ اگر وہ اپنے خیالات و معتقدات سے توبہ کر لیتے۔ اپنا
رویہ بدل لیتے اور معافی مانگ لیتے تو ان کی جان بخشی ہو سکتی تھی اور وہ زندہ جلا دیئے
جانے سے بچ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیشہ گلیلو کے مقدمے کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس پر

---

[1] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے عیسائی وفد کو مسجد نبوی میں ان کے اپنے طریقے
سے عبادت کرنے کی اجازت دی تھی جس کی تقلید عیسائی کلیسا نے چودہ سو سال بعد کی (مترجم)

اس لیے مقدمہ چلایا گیا تھا کہ اس نے زمین کی گردش کے بارے میں کوپرنیکس کے انکشافات و
نظریات کو قبول کر لیا تھا۔ گلیلو کو بائبل کو غلط تاویل و تفسیر کر کے سزائے موت دی گئی کیونکہ
صحیح اور معقول طریقے سے تو صحف انبیا یعنی بائبل سے اس کے خلاف کوئی ثبوت اور سزا
کا جواز نہ مل سکا تھا۔[1]

اس کے برعکس سائنس کے متعلق اسلام کا رویہ بالعموم کافی حد تک مختلف تھا۔ پیغمبر
اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس حدیث سے واضح تر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ "علم
حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے"۔ (اطلبوا العلم ولو کان بالصین)
یا یہ دوسری حدیث کہ "طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے (طلب العلم فریضۃ
علیٰ کل مسلم و مسلمۃ)۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ قرآن جہاں ہمیں اپنے اندر سائنسی
علوم کا ذوق پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہاں خود مظاہر فطرت کی طرف توجہ بھی دلاتا ہے
اور ان کی ایسی تشریحی تفاصیل پیش کرتا ہے جو جدید سائنسی معلومات سے بالکل میل کھاتی ہیں۔
یہودیوں، عیسائیوں کی کتب مقدسہ میں یہ بات نہیں ملتی۔

تاہم یہ تصور کرنا غلط ہو گا کہ اسلام کی تاریخ میں اس کے پیروؤں میں سے کبھی کسی نے
سائنس کے متعلق اس سے مختلف رویہ اختیار ہی نہیں کیا۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ تاریخ کے
بعض ادوار میں مسلمانوں نے اپنے کو اور دوسروں کو تعلیم دینے کے فرض سے غفلت برتی
یہ بھی درست ہے کہ دوسرے ممالک کی طرح اسلامی ممالک میں بعض دفعہ سائنسی ترقی کی
راہ روکنے کی کوشش کی گئی، تاہم یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے بارہویں
صدی عیسوی تک جب اسلام عروج پر تھا، اور عیسائی دنیا میں سائنسی تعلیم و ترقی پر پابندیاں
عائد تھیں، اسلامی یونیورسٹیوں میں سائنسی تحقیقات اور انکشافات کا کام زور شور سے جاری تھا
اور بہت سے نئے نئے انکشافات کیے گئے۔ اس عہد کے حیرت انگیز تہذیبی و ثقافتی خزانوں

---

[1] موت کو سامنے دیکھ کر اونچی آواز سے تو گلیلو نے کہہ دیا کہ زمین گردش نہیں کرتی لیکن زیر لب
پھر بھی کہا کہ گردش کرتی ہے (And yet it rotates)۔ مترجم۔

وسائل صرف وہیں مل سکتے تھے۔ اسپین کے دارالخلافہ قرطبہ میں جو اموی خلیفہ کی لائبریری تھی اس میں چار لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ وہاں ابن ارشد[1] درس دیتا تھا اور وہاں یونانی، ہندی اور ایرانی علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ بھر سے تشنگانِ علم قرطبہ کی یونیورسٹی کا رخ کرتے تھے بعینہ جیساکہ آج کل لوگ تکمیلِ علم کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ جاتے ہیں۔ قدیم قلمی نسخوں کی بہت بڑی تعداد انہی مہذب اور باذوق عربوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ انھوں نے اپنے مفتوحہ ممالک کے علم و تہذیب و ثقافت کو ہم تک پہنچایا۔ ہم ریاضی (الجبرا تو ہے ہی عربوں کی ایجاد) ہیئت، طبیعیات (بصریات)، ارضیات، نباتیات، علم طب (ابو علی سینا[2]) وغیرہ کے لیے بھی ہم عربوں کے ممنون احسان ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کی اسلامی یونیورسٹیوں میں سائنس کو پہلی دفعہ بین الاقوامی نوعیت اور خصوصیت حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں آج کے مقابلے میں لوگوں پر نسبتاً مذہبی رنگ زیادہ غالب تھا لیکن یہ دنیائے اسلام میں لوگوں کو بیک وقت صاحبِ ایمان اور سائنسدان ہونے سے مانع نہیں آیا۔ سائنس اور مذہب جڑواں بھائیوں کی طرح تھے اور انھیں ہمیشہ ایسا ہی رہنا چاہیے تھا۔

جہاں تک عیسائی دنیا کا تعلق ہے، ازمنۂ وسطیٰ میں اس پر جمود اور تقلید پرستی طاری رہی۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ یہودیوں، عیسائیوں کی الہامی کتابوں نے سائنسی تحقیقات کی رفتار ترقی کو بریک نہیں لگائے بلکہ ان لوگوں نے بریک لگائے جو وحی و الہام کے خادم ہونے کے مدعی تھے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد سائنسدانوں میں قدرتی طور پر یہ ردِعمل پیدا ہوا کہ اپنے سابق دشمنوں سے انتقام لیں۔ یہ انتقام کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور حد یہ ہے کہ اگر مغرب میں کوئی سائنسی حلقوں میں خدا کی بات کرتا ہے تو نکو بنتا ہے۔ اس روش سے یونیورسٹیوں میں

---

[1] مشہور مسلمان فلسفی اور عالم جو ارسطو کے فلسفہ کا سب سے بڑا شارح ہوا ہے۔ اٹھارہویں صدی تک اس کی کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ مترجم

[2] ابو علی سینا کی مشہور کتاب 'القانون' صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہی۔ مترجم

زیرِ تعلیم نوجوانوں کی سوچ متاثر ہوتی ہے اور مسلمان نوجوان بھی اس سے مستثنیٰ اور مامون نہیں۔ سربرآوردہ سائنسدانوں نے جو انتہا پسندانہ مواقف اختیار کیے ہیں، ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نوجوانوں کی سوچ اس سے مختلف ہو ہی نہیں سکتی تھی، ایک سائنسدان جسے طبی تحقیقات پر نوبل پرائز ملا ہے، گزشتہ چند سال کے دوران میں اس نے عام اشاعت کے لیے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے قارئین کو قائل کرنے کی کوشش کی ہے متعدد بنیادی مرکبات سے اتفاقی طور پر اپنی تخلیق آپ کر سکے۔ وہ کہتا ہے کہ اس ابتدائی جاندار مادے سے مختلف خارجی واقعات کے زیرِ اثر منظم طور پر زندہ جاندار متشکل ہوئے اور بالآخر اس پیچیدہ اور ایک سے زیادہ سے بنے ہوئے جاندار کا ظہور ہوا جسے انسان کہتے ہیں۔

زندگی کے بارے میں دورِ حاضر کے سائنسی علم کے ان عجائبات سے ایک سوچنے والا انسان یقیناً ایک برعکس نتیجے پر پہنچے گا۔ جو تنظیم پیدائش اور زندگی کی خبرگیری اور مایحتاج کی ذمہ دار ہے، جیسے جیسے اس کا مطالعہ کیا جائے، ویسے ویسے وہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر معلوم ہوتی ہے۔ اس تنظیم کا علم حاصل ہونے سے انسان یقیناً یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ زندگی کے ظہور میں اتفاق کے دخل کا بہت ہی کم امکان ہے۔ جوں جوں انسان علم کی شاہراہ پر آگے بڑھتا ہے خاص کر بے حد چھوٹی چیزوں کے بارے میں جوں جوں زیادہ معلومات حاصل ہوتی جاتی ہیں، توں توں ایک خالقِ کائنات کے وجود کے متعلق زیادہ دلائل سامنے آنے لگتے ہیں لیکن بجائے اس کے کہ ایسے حقائق کی موجودگی میں انسان پر عجز و انکسار کی کیفیت طاری ہو، وہ غرور و تکبر سے بھر جاتا ہے۔ وہ خدا کے تصور کا اسی طریقے سے مذاق اڑاتا ہے، جس طرح وہ ہر اس چیز کو برا کہتا ہے جو اس کے عیش و نشاط کی راہ میں حائل ہو۔ مغرب کے موجودہ مادہ پرست کا یہی حال ہے۔

ہمارے عہد کے بہت سے سائنسدانوں کی فکری و نظری آلودگی کا مقابلہ کرنے کے لیے کونسی روحانی قوتوں سے کام لیا جا سکتا ہے؟

یہودیت اور عیسائیت کو تو اس بات کا کھلم کھلا اعتراف ہے کہ مغرب مادیت

کے جس سیل بے پناہ کی زد میں ہے اور اس پر دہریت نے جو یلغار کی ہے، وہ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں جیسے دونوں کو اس سیلاب اور یلغار نے بے خبری میں آلیا ہو! اور ہر ... میں ان کی طرف اس سیلاب کی مزاحمت کم سے کمتر ہوتی چلی گئی ہے اور خطرہ ہے کہ یہ سیلاب ہر چیز کو بہالے جائے گا۔

مادہ پرست دہریئے کو کلاسیکی عیسائیت محض ایک ایسا نظام معلوم ہوتی ہے جسے دو ہزار سال پہلے کچھ انسانوں نے اپنے ساتھی انسانوں پر اقلیت کی حاکمیت قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے وضع کیا تھا۔ اسے یہودی، عیسائی نوشتوں میں ایسی زبان نظر نہیں آتی جو اس کی اپنی زبان سے ذرا بھی مشابہ ہو کیونکہ ان نوشتوں میں اس قدر مستبعدات، تضادات پائے جاتے ہیں جو جدید سائنسی معلومات سے ہم آہنگ نہیں۔ اس لیے وہ ان نوشتوں کے ان متنوں کو در خورِ اعتنا نہیں سمجھتا جنھیں علمائے دین کی بڑی اکثریت کی رائے میں جوں کا توں قبول کر لینا چاہیے۔

جب مادہ پرست دہریئے کے سامنے اسلام کا نام لیا جاتا ہے تو وہ ایسی دل جمعی سے مسکرا دیتا ہے جو موضوع سے اس کی ناواقفیت سے لگا کھاتی ہے۔ مغربی دانش وروں کی اکثریت۔ خواہ وہ کسی بھی مذہبی فرقے یا مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں۔ کی طرح وہ بھی اسلام کے بارے میں غلط تصورات کا بہت بڑا ذخیرہ رکھتا ہے۔

اس بارے میں وہ ایک دو معقول عذر رکھتا ہے۔ اول یہ کہ کیتھولک کلیسا کے اعلیٰ ترین اربابِ اختیار کے حال ہی میں اختیار کردہ نئے رویے سے قطع نظر مغرب میں ہمیشہ اسلام کے خلاف نام نہاد غیر مذہبی دنیاوی قسم کی بہتان طرازی کی جاتی رہی ہے۔ مغرب میں جس کسی نے بھی اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ لیسے اسلام کی تاریخ" عقائد اور مقاصد کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس موضوع پر یورپی زبانوں میں جو کتابیں وغیرہ شائع ہوتی ہیں (متخصصانہ مطالعات سے قطع نظر کرکے) ان سے ایسے شخص کا کام آسان نہیں ہو جاتا جو اسلام کے متعلق اپنی خوشی سے صحیح معلومات حاصل کرنے کا خواہشمند ہو۔

اس نقطۂ نظر سے بنیادی طور پر یہ ضروری ہے کہ اسلامی وحی و تنزیل کا علم حاصل کیا جائے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ قرآن کی عبارات، خاص کر وہ جو سائنسی حقائق و معلومات سے متعلق ہیں کے خراب ترجمے اور تفسیریں کی جاتی ہیں۔ اس لیے ایک سائنسدان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ تنقید اور نکتہ چینی کرے اور اس کا بظاہر جواز بھی ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن اس تنقید اور نکتہ چینی کا ہرگز ... جب نہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ ترجمے کی غلطیاں یا غلط تفسیریں، (اکثر دونوں کا آپس میں تعلق ہوتا ہے)، جن پر ایک دہائی پہلے کسی کو حیرت نہ ہوتی، جدید سائنسدانوں کو ناگوار گزرتی ہیں۔

جب ان کے سامنے کوئی غلط سلط طریقے سے ترجمہ کیا ہوا جملہ آتا ہے اور وہ کسی ایسے بیان پر مشتمل ہوتا ہے جو سائنسی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول نہ ہو تو سائنسدان کو یہ بات اس پر سنجیدگی سے غور کرنے سے مانع آتی ہے۔ انسانی تولید و تناسل سے متعلق باب میں اس قسم کی غلطی کی ایک واضح مثال دی جائے گی۔

ترجمے میں اس قسم کی غلطیاں کیوں پائی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید مترجمین اکثر پرانے شارحین کی تشریحات و توضیحات کو جرح و تنقید کے بغیر قبول کر لیتے ہیں۔ اگر ان مفسرین نے اپنے زمانے میں کسی عربی لفظ کے متعدد ممکنہ معانی میں سے انتخاب کرتے وقت اس کی غلط تعریف و توضیح کی تو وہ معذور تھے کیونکہ سائنسی معلومات کی روشنی میں اس لفظ یا جملے کے جو معنی آج کل واضح ہوئے ہیں، ان کے زمانے میں ان کی سمجھ میں نہیں آسکتے تھے۔ بالفاظِ دیگر مسئلہ تراجم اور تشریحات پر نظرِ ثانی کی ضرورت کا ہے۔ زمانۂ گزشتہ کے ایک مخصوص دور میں ایسا کرنا ممکن نہ تھا لیکن آج کل جو علم ہمیں حاصل ہے اس کی مدد سے ہم الفاظ و فقرات کے صحیح معانی و مطالب ادا کر سکتے ہیں۔ ترجمے کے یہ مسائل یہودی عیسائی کتبِ مقدسہ کے متنوں کے متعلق پیدا نہیں ہوتے۔ یہ مسئلہ تو قرآن کے الفاظ و فقرات کے ترجمے سے مخصوص ہے۔

یہ سائنسی ملاحظات اور قابلِ غور امور قرآن سے مخصوص ہیں۔ ابتدا میں مجھے ان پر حیرت ہوئی تھی۔ تب تک مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ایک ایسی کتاب (قرآن) جو تیرہ

صدی قبل مرتب کی گئی، اس میں ایسے کثیر بیانات ملنے کا بھی امکان ہے جو بے حد متنوع موضوعات سے متعلق ہوں گے اور جدید سائنسی علوم سے مکمل طور پر ہم آہنگ۔ شروع میں مجھے اسلام پر قطعاً کوئی اعتقاد نہ تھا، میں نے قرآن کا غائر مطالعہ بالکل کھلے دل و دماغ سے کامل معروضی طور پر شروع کیا۔ اگر مجھ پر کوئی اثر کار فرما تھا تو وہ میری نوجوانی کے زمانے کی تعلیم کا تھا۔ اس زمانے میں اسلام کے پیروؤں کو اہل مغرب 'مسلم' نہیں کہتے تھے بلکہ 'محمڈن' کہتے تھے جس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ اسلام ایک ایسا مذہب تھا جس کی بنیاد ایک انسان (محمدؐ) نے رکھی تھی۔ اس لیے اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ اس لیے اس کی کوئی قدر و قیمت تھی، بہت سے اہلِ مغرب کی طرح میں بھی اسلام کے بارے میں ان غلط تصورات پر قائم رہا ہوتا کیونکہ آج کل یہ غلط تصورات اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ جب کسی ماہر اور متخصص کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس موضوع پر روشن خیالی اور باوقوف طریقے سے بات کرتا ہے تو واقعی حیرت ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے اعتراف ہے کہ جب تک میں اسلام کے بارے میں اہلِ مغرب کے غلط تصور سے مختلف تصور سے دوچار نہیں ہوا تھا، میں خود بھی بے حد جاہل اور ناواقف واقع ہوا تھا۔

یہ تو استثنائی حالات تھے جنھوں نے مجھے اسلام کے متعلق اہل مغرب کے تصورات اور فیصلوں کی غلط نوعیت کو سمجھنے کے قابل بنادیا۔ اسلام کے متعلق اہلِ مغرب کے آرا و خیالات کس قدر غلط ہیں، اس کا خفیف سا علم اور اندازہ مجھے خود سعودی عرب میں جاکر ہوا۔ اس کے لیے میں مرحوم شاہ فیصل کا بے حد مرہونِ احسان ہوں اور میرے دل میں ان کا انتہائی احترام اور عزت ہے۔ میں ایک احساس تشکر کے ساتھ انھیں سلام کرتا ہوں۔ یہ میری یادوں کا قیمتی سرمایہ ہے کہ مرحوم نے مجھے یہ غیر معمولی عزت بخشی کہ میں نے خود ان کی زبان سے اسلام کے متعلق تقریر سنی اور پھر جدید سائنس کے ناطے سے قرآن کی تعبیر و ترجمانی کے بارے میں ان سے بعض مسائل پر بات چیت کی۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا کہ بہ نفس نفیس ان سے اور ان کے قریبی حضرات سے اس قدر قیمتی معلومات حاصل کرسکا۔

چونکہ اب مجھے وہ بعد اور خلا نظر آگیا تھا جو اسلام کے متعلق مغربی تصور اور حقیقت واقعی میں پایا جاتا ہے، اس لیے مجھے عربی سیکھنے کی سخت ضرورت محسوس ہوئی (کیونکہ میں عربی بول نہیں سکتا تھا) تاکہ اس مذہب (اسلام) کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے قابل ہو سکوں جس کے متعلق مغرب میں اس قدر غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ میرا پہلا مقصد یہ تھا کہ قرآن پڑھ کر اس کے ایک ایک فقرے، ایک ایک آیت کا تجزیہ کروں اور اس میں ان مختلف تفاسیر سے مدد لوں جو تنقیدی مطالعے کے لیے ضروری ہوں۔ میرا طریقہ یہ تھا کہ مظاہر فطرت کے متعلق قرآن میں جو بیانات ہیں، میں نے ان پر خصوصی توجہ دی۔ مظاہر فطرت کے بارے میں قرآن میں جو بے حد صحیح تفصیلات ملتی ہیں اور جو صرف اصل عربی متن ہی سے نمایاں ہوتی ہیں، ان کے مطالعے سے مجھے حیرت ہوئی کہ وہ زمانۂ جدید کے تصورات کے عین مطابق تھیں اگرچہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے کے کسی شخص کو یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد میں، میں نے قرآنی متن کے سائنسی پہلوؤں پر مسلمان مصنفین کی لکھی ہوئی متعدد کتابیں پڑھیں اور مجھے ان سے بہت مدد ملی۔ لیکن اس موضوع پر کسی مغربی مصنف کی کوئی کتاب اب تک مجھے نہیں ملی جس میں اس نوعیت کا عمومی مطالعہ پیش کیا گیا ہو۔

قرآن کا پہلی بار مطالعہ کرتے وقت قاری کو ابتدا ہی سے مضامین اور موضوعات کے تنوع اور فراوانی پر حیرت ہوتی ہے مثلاً تخلیق، ہیئت، زمین سے متعلق بعض امور کی تشریح، حیوانات، نباتات، انسانی تولید و تناسل۔ ان موضوعات سے متعلق بائبل میں شدید غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن قرآن میں مجھے ایک بھی غلطی نہیں ملی۔ مجھے رک کر اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑا کہ اگر قرآن کسی انسان کی تصنیف ہوتی تو وہ ساتویں صدی عیسوی میں اس میں ایسے حقائق کیسے لکھ سکتا تھا جو جدید سائنسی علم اور معلومات کے عین مطابق معلوم ہوتے ہیں؟ اس میں قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ قرآن کا جو متن آج پایا جاتا ہے یہ یقیناً اسی زمانے کا ہے (اس حصۂ کتاب کے اگلے باب میں اس مسئلے پر بحث کروں گا) کیا اس کی کوئی انسانی توجیہ و تشریح ہو سکتی ہے؟ میرے خیال میں ایسی کوئی توجیہ ممکن

نہیں۔ ایسی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی کہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک شخص کو ایسے زمانے میں جب کہ فرانس پر شاہ ڈیگوبرٹ (Dagobert) حکمران تھا۔ (۶۲۹-۶۳۹ء)۔ بعض موضوعات پر ایسا سائنسی علم حاصل ہو جو ہمیں ایک ہزار سال بعد میں حاصل ہوا۔ یعنی حامل قرآن نے ان سائنسی علوم میں ہم سے ایک ہزار سال پہلے سبقت کی۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں، جو تقریباً بیس سال پر محیط ہے، یہ عالم تھا کہ صدیوں سے سائنسی علوم و فنون پر جمود طاری تھا اور ترقی ناپید تھی، اسلامی تہذیب کی حرکت و سرگرمی اور اس کی ہم رکاب سائنسی ترقی کا آغاز نزول قرآن کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد ہوا۔ اس قسم کے مذہبی اور غیر مذہبی کوائف و معلومات سے لاعلمی ہی اس طرح کی اوٹ پٹانگ قیاس آرائی کا باعث ہو سکتی ہے جو بارہا میرے سننے میں آچکی ہے کہ اگر قرآن میں حیران کن سائنسی نوعیت کے بیانات پائے جاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عرب سائنسدان اپنے زمانے سے بہت آگے تھے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی سائنسی تحقیق سے متاثر تھے! جو شخص اسلامی تاریخ کے متعلق کچھ جانتا ہے، وہ اس بات سے آگاہ ہے کہ دنیائے عرب میں سائنس، تہذیب، ثقافت کو عروج ازمنۂ وسطیٰ میں حاصل ہوا یعنی محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کے بہت بعد۔ اس لیے ایسا باخبر آدمی من مانی رائے زنی اور قیاس آرائی نہیں کرے گا۔ اس قسم کی قیاس آرائیاں بالخصوص اپنے ہدفِ مقصود سے ہٹی ہوئی ہیں کیونکہ سائنسی حقائق کی اکثریت جن کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے یا بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، ان کی تصدیق و توثیق صرف موجودہ زمانے میں ہوئی ہے۔

لہٰذا آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے کہ کیسے صدیوں تک مفسرین قرآن (بشمول ان کے جنھوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کے عروج کے زمانے میں تفاسیر لکھیں) ناگزیر طور پر بعض آیات کی تفسیر میں غلطیاں کرتے رہے کیونکہ اس زمانے میں ان کا صحیح مطلب پالینا ممکن نہ تھا۔ ان کا صحیح ترجمہ اور تفسیر کرنا بہت بعد میں ممکن ہو سکا اور وہ زمانہ ہمارے زمانے سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآنی آیات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے محض زبان

کا وسیع و عمیق علم کافی نہیں۔ اس کے ساتھ سائنسی علوم کی مختلف شاخوں سے گہری واقفیت ضروری ہے۔ اس کتاب میں جو تحقیقی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے وہ سائنس کی بہت سی شاخوں کو محیط ہے اور اس لحاظ سے قاموسی حیثیت رکھتا ہے۔ جوں جوں سوالات زیرِ بحث آئیں گے توں توں سائنسی علم کی وہ قسمیں واضح ہوتی جائیں گی جو قرآن کی بعض آیات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔

تاہم قرآن کا مقصد کائنات میں جاری و ساری بعض قوانین کی تشریح کرنا نہیں۔ اس کا ایک بالکل بنیادی مذہبی مقصد ہے۔ خدا کی قدرتِ کاملہ کے متعلق قرآن میں جو بیانات ملتے ہیں انھیں پڑھ کر انسان کو تخلیق کائنات پر غور و فکر کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔ ان بیانات میں ایسے حقائق کے حوالے ملتے ہیں جو انسانی مشاہدے میں آسکتے ہیں یا خدا کے مقررہ قوانین کے حوالے جو نظام کائنات کا حکمران ہے اور قدرتی سائنسی علوم اور انسان اس کائنات کا حصہ ہیں۔

ان دعووں کا ایک حصہ تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے لیکن دوسرے حصے کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ جب تک کہ اس کے لیے درکار اور ضروری سائنسی علم حاصل نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ وقتوں میں آدمی ظاہری مطلب ہی جان سکتا تھا اور اپنے ناکافی علم کی وجہ سے وہ غلط نتائج اخذ کرتا رہا۔ ممکن ہے کہ جن قرآنی آیات کو ان کی سائنسی نوعیت کی بنا پر میں تحقیقی مطالعے کے لیے منتخب کر رہا ہوں، وہ بعض مسلمان مصنفین کو اتنی اہم معلوم نہ ہوں کیونکہ وہ مجھ سے پیشتر ہی ان کی طرف توجہ مبذول کرا چکے ہیں۔ لیکن عمومی حیثیت سے مجھے یقین ہے کہ میں نے ان کے مقابلے میں نسبتاً قدرے کم آیات کا انتخاب کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے متعدد ایسی آیات کو بھی تحقیقی مطالعے کے لیے منتخب کیا ہے جنھیں میرے خیال میں اس سے پہلے وہ اہمیت نہیں دی گئی جو سائنسی نقطۂ نظر سے دی جانی چاہیے تھی۔ اگر کہیں غلطی سے مجھ سے بعض وہ آیات چھوٹ گئی ہوں جو ان مصنفین نے سائنسی مطالعے کے لیے منتخب کی تھیں، تو مجھے امید ہے کہ اس کے لیے وہ مجھے موردِ الزام و عتاب نہیں ٹھہرائیں گے۔ کبھی کبھی کہیں کہیں میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ بعض کتابیں جن میں

آیات کی سائنسی تعبیرات و تشریحات دی گئی ہیں، صحیح نہیں ہیں۔ میں نے ایسی آیات کی اپنی طرف سے تفسیر و تشریح دیتے وقت کھلے دل و دماغ سے کام لیا ہے اور میرا ضمیر بالکل صاف ہے۔ اسی طرح ایسے مظاہر جو انسانی عقل و فہم میں آسکتے ہیں لیکن جدید سائنس نے ان کی تصدیق نہیں کی، میں نے ان کے لیے بھی قرآن سے حوالے ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ میں نے کائنات میں زمین سے مشابہ سیاروں کی موجودگی کے متعلق قرآن میں اشارے پائے ہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ بہت سے سائنسدان اسے بالکل ایک حقیقت ممکنہ سمجھتے ہیں اگرچہ جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں اسے ایک یقینی امر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بارے میں ذہنی تحفظات کے باوجود میں نے اس کا ذکر کرنا فرض سمجھا۔

اگر یہ تحقیقی مطالعہ آج سے دس سال پہلے کیا گیا ہوتا تو اس میں علم ہیئت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہوتا، تو اب اس میں ایک اور حقیقت کا اضافہ کرنا پڑتا جس کی پیشن گوئی قرآن نے کر دی تھی۔ اور یہ حقیقت ہے خلا کی تسخیر، اس وقت دور مار میزائلوں کے ابتدائی تجربوں کے بعد لوگوں کے ذہن میں ایک ایسے دن کا تصور ابھرا جب انسان کو ایسے مادی اسباب اور امکانات میسر آجائیں گے کہ وہ اپنے ارضی وطن سے نکل کر خلا کی تحقیقات کر سکے۔ اس وقت یہ معلوم تھا کہ قرآن میں ایک آیت موجود ہے جس میں یہ پیشن گوئی کی گئی ہے کہ ایک دن انسان خلا کو تسخیر کرے گا۔ اب قرآن کے اس بیان کی تصدیق ہو گئی ہے۔[1]

---

[1] قرآن مجید کی وہ آیت یہ ہے: يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا ۚ لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ ۝ (سورہ رحمٰن، آیت ۳۳)
ترجمہ: اے گروہ جن و انس! اگر تم میں زمین اور آسمانوں کے تمام خطوں میں گھس جانے کی طاقت ہے تو گھس جاؤ، ہماری منظوری کے بغیر تم کبھی نہیں گھس سکو گے۔" یہ اردو ترجمہ محمد مارما ڈیوک پکتھال کے انگریزی ترجمے کا ترجمہ ہے اور پچاس برس پہلے کا ہونے کے باوجود اس میں خلا کی تسخیر کے بعد نئی صورت حال سے ہم آہنگ ہونے کی گنجائش ہے جبکہ قدیم عربی، اردو تراجم میں خلائی تسخیر کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

الہامی کتابوں اور سائنس کے درمیان موجودہ محاذ آرائی سے بعض خیالات و تصورات بائبل اور قرآن دونوں کے متعلق بروئے کار آرہے ہیں جن کا تعلق سائنسی حقیقت سے ہے اس محاذ آرائی کو جائز اور بجا ثابت کرنے کے لیے جن سائنسی دلائل پر تکیہ کیا جائے وہ بالکل مسلم الثبوت ہونے چاہییں اور ان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ وہ لوگ جو الہامی کی جانچ پرکھ میں سائنس کی مداخلت کے تصور سے بدکتے ہیں وہ سائنس کو مقابلہ و موازنہ کی معقول اور جائز شرط نہیں مانتے (خواہ یہ بائبل کے متعلق ہو جو اس مقابلے سے تلوہ اور صحیح و سالم اور بے داغ بچ کر نہیں نکلتی اور ہم اس کی وجوہات دیکھ چکے ہیں، یا قرآن کے متعلق جسے سائنس سے کوئی خطرہ نہیں)۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ سائنس میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اس لیے آج ہم جس بات کو حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیں، ہو سکتا ہے کہ بعد میں وہ مسترد قرار پائے۔

اس رائے سے متعلق یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی نظریئے (تھیوری) اور منظم

(بقیہ حاشیہ) امکان کی کوئی پیش بینی نہیں ملتی۔ قرآنی آیت کی پوری معنویت اب سامنے آتی ہے۔ مولوی محمد شہاب الدین (بنگلور، بھارت) نے اپنی تصنیف "چاند کی تسخیر قرآن میں" اسی موضوع کے لیے وقف کی ہے اور اس آیت نیز بعض دوسری آیات سے خلائی تسخیر کے امکانات کے دلائل پیش کیے ہیں۔ بعض جدید مصری مصنفین نے بھی ادھر توجہ دلائی ہے۔

قدما تو خیر اپنے زمانے کی سائنسی معلومات اور حقائق سے آگے بڑھ کر خلائی تسخیر کا تصور نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسے عظیم عالم اور مفسر کا ذہن بھی اس آیت کا ترجمہ و تفسیر کرتے وقت ادھر نہیں گیا حالانکہ تسخیر خلا کا کام ۱۹۵۷ء میں روس کے پہلے خلائی سیارے "سپوتنک" کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ اور مولانا مرحوم کی وفات سے پہلے تو امریکی چاند پر پہنچ بھی چکے تھے۔ مولانا مرحوم نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: "اے گروہ جن و انس اگر تم زمین اور آسمانوں کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ کر دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے۔ اس کے لیے بڑا زور چاہیے۔" ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ قرآن مجید کے ابدی پیغام کی خلائی دور کی ترجمانی نہیں کرتا۔ مترجم

طریقے سے مشاہدہ کردہ حقیقت میں حدِ امتیاز قائم کرنا ضروری ہے۔ تھیوری یا نظریے کا مقصد کسی ایسے مظہرِ فطرت یا مظاہرِ فطرت کے سلسلے کی تشریح و توضیح ہوتا ہے جو آسانی سے سمجھ میں نہ آئے۔ بارہا تھیوری یا نظریئے میں تبدیلی آجاتی ہے۔ جب سائنسی ترقی کے طفیل حقائق اور صورتِ حال کا تجزیہ کرنا آسان ہوجاتا ہے اور زیادہ قرین قیاس توضیح و تشریح ممکن ہوجاتی ہے تو تھیوری میں ترمیم ہوجاتی ہے یا اس کی جگہ کوئی دوسری تھیوری لے لیتی ہے۔ اس کے برعکس ایک امر واقعہ جو مشاہدے میں آیا ہو اور عملی تجربے سے اس کی تنقیح و توثیق ہوگئی ہو اس میں ترمیم کا امکان نہیں ہوتا۔ اس کے خواص کو متعین کرنا زیادہ آسان ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ جوں کا توں رہتا ہے۔ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ اس حقیقت واقعی میں کسی ترمیم اور تبدیلی کا امکان نہیں۔ مستقبل میں صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ان کے مداروں کو زیادہ واضح طور پر معین کیا جائے۔

مثلاً تھیوری کی تغیر پذیر نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے قرآن کی ایک آیت کو قبول نہیں کیا جس کے متعلق ایک مسلمان طبیعیات دان کا خیال تھا کہ اس میں ضد مادہ (Anti matter) کے تصور کی پیشین گوئی پائی جاتی ہے حالانکہ یہ ایک ایسی تھیوری ہے جس پر ابھی بڑی بحث و تمحیص جاری ہے۔ اس کے برعکس قرآن کی ایک دوسری آیت پر بجا طور پر بڑی توجہ دی جاسکتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا۔ یہ ایک ایسا مظہرِ فطرت ہے جس کی ہم کبھی عملی تصدیق اور جانچ پرکھ نہیں کرسکیں گے لیکن بہت سے دلائل اس کے حق میں جاتے ہیں۔ جہاں تک مشاہدے میں آئے ہوئے امور کا تعلق ہے مثلاً انسانی جنس کا ارتقاء یہ عین ممکن ہے کہ جنس کے ارتقا کے جو مختلف مرحلے قرآن میں بیان کیے گئے ہیں اگر ان کا جدید جنیات کی فراہم کردہ معلومات سے مقابلہ کیا جائے تو اس موضوع پر قرآنی آیات اور جدید سائنس میں مکمل ہم آہنگی پائی جائے گی۔

قرآن اور سائنس کے اس باہمی مقابلے کی تکمیل دو دوسرے موازنوں سے ہوجاتی ہے اول یکساں موضوعات پر جدید علم اور بائبل کی معلومات وکوائف کا موازنہ۔ دوم۔ پیغمبر اسلام محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) پر خدا کی نازل کردہ کتاب قرآن میں دی گئی معلومات اور محمد

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اعمال واقوال کو بیان کرنے والی کتب احادیث "جو تحریر میں آئی ہوئی وحی و تنزیل کی حدود سے باہر ہیں" میں دی گئی معلومات کا باہمی مقابلہ و موازنہ۔

اس کتاب کے تیسرے حصے کے آخر میں ایک واقعے کے بارے میں بائبل اور قرآن کے تقابلی مطالعے کے نتائج دیئے گئے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب کسی عبارت پر سائنسی نقطۂ نظر سے نقد و جرح کی گئی تو نتیجہ کیا رہا۔ مثلاً پیدائش اور طوفان (نوح) کے بارے میں دونوں کتابوں کے بیانات کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ بائبل کے بیانات میں سائنس سے جو تضاد پایا جاتا ہے، اسے واضح کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس ان موضوعات سے متعلق قرآن کے بیانات اور سائنس میں جو کامل ہم آہنگی اور موافقت پائی جاتی ہے، وہ بھی آشکارا کی گئی ہے ہم ان اختلافات کو ٹھیک اور صاف طور پر نوٹ کریں گے جن کی رو سے ایک بیان تو اس زمانے میں سائنسی طور پر قابلِ قبول ہے اور دوسرا ناقابلِ قبول۔

یہ مشاہدہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ مغرب میں یہودی، عیسائی اور دہریے بغیر کسی ثبوت اور شہادت کے اس بات پر متفق ہیں کہ بائبل کی نقل کے طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآن لکھا یا کسی سے لکھوایا۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن میں جو مذہبی تاریخ سے متعلق واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بائبل کے بیان کردہ واقعات کا خلاصہ ہیں۔ یہ رویہ غور و فکر سے اتنا ہی عاری ہے جتنا کہ یہ کہنا کہ خود عیسیٰ مسیحؑ نے بھی اپنی پیغمبرانہ تبلیغ کے دوران میں عہد نامۂ عتیق سے استفادہ و فیضان حاصل کرکے اپنے ہم عصروں کو بیوقوف بنایا۔ مسیحی کی پوری انجیل کی بنیاد عہد نامہ عتیق کے تسلسل پر ہے جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ کیا اس بنا پر کوئی ماہر تفسیر عیسیٰ مسیحؑ کے خدا کا پیغمبر ہونے سے انکار کرسکتا ہے یا ایسا خواب بھی دیکھ سکتا ہے؟ لیکن اہلِ مغرب اکثر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں یہ فیصلہ سناتے ہیں کہ "انھوں نے محض بائبل کی نقل کی"۔ یہ ایک سرسری اور عاجلانہ فیصلہ ہے جس میں اس امر کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ ایک ہی واقعے کے بارے میں قرآن اور بائبل کے بیانات مختلف ہوتے ہیں لوگ بیانات کے اختلافات کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔ اور اعلان کردیا جاتا ہے کہ وہ ایک ہی طرح کے ہیں لہٰذا سائنسی علم کو بیچ میں لانے کی ضرورت نہیں۔ جب ہم

پیدائش اور طوفان کے بارے میں دونوں کتابوں کے بیانات پر بحث اور ان کا مقابلہ کریں گے تو ان مسائل کو تفصیل سے زیرِ غور لائیں گے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور احادیث کے مجموعوں کا وہی تعلق ہے جو مسیحؑ اور اناجیل کا ہے۔ یعنی ان میں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اعمال اور اقوال کے تفصیلی بیانات ملتے ہیں۔ ان مجموعہ ہائے احادیث کے مصنف یا مولف واقعات کے عینی شاہد نہ تھے۔ (کم سے کم یہ بات ان مجموعہ ہائے احادیث کے مولفین پر صادق آتی ہے' جنھیں مستند ترین اور صحیح ترین کہا جاتا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانۂ حیات کے بعد جمع کئے گئے) بہرحال یہ مجموعے وحیِ مکتوب کی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ خدا کا کلام نہیں' بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اقوال ہیں۔ ان کتابوں کا مطالعہ بہت عام ہے لیکن ان میں بعض ایسے بیانات ملتے ہیں جن میں سائنسی نقطۂ نظر سے غلطیاں پائی جاتی ہیں خاص کر طبی علاجات کے بارے میں ہم قدرتی طور پر مذہبی نوعیت کے مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں کیونکہ یہاں احادیث کے حوالے سے ان پر بحث نہیں کی گئی۔ بہت سی احادیث کا درجہ مشکوک ہے اور ان پر خود مسلمان سائنسدانوں نے جرح و تنقید کی ہے۔ اس کتاب میں جب سائنسی نقطۂ نظر سے کسی حدیث کی حیثیت زیرِ بحث آئی ہے تو اس کا اصل مقصد حدیث کو سائنسی نقطۂ نظر سے قرآن سے الگ دکھانا اور دونوں کے درمیان مابہ الامتیاز قائم کرنا ہے کیونکہ قرآن میں کوئی ایک بھی ایسا بیان نہیں ملتا جو سائنسی نقطۂ نظر سے ناقابلِ تسلیم ہو۔ جیسا کہ ہم دیکھیں قرآن اور حدیث کا یہ باہمی فرق خاصا چونکا دینے والا ہے۔ جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قرآن کا مصنف سمجھتے ہیں' مندرجہ بالا ملاحظہ کی روشنی میں ان کا مفروضہ قرینِ عقل نہیں رہتا۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک انسان جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا اور اُمی تھا وہ ادبی وصف اور مرتبے کے لحاظ سے پورے عربی ادب میں اہم ترین مصنف بن گیا؟ اس نے سائنسی نوعیت کے ایسے حقائق کیسے بیان کئے جو اس زمانے میں کسی دوسرے انسان کو نہیں سوجھے تھے؟ اور پھر ان موضوعات پر اس کے بیانات میں غلطی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔؟

اس کتاب میں خالصتاً سائنسی نقطۂ نظر سے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے ایک انسان کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قرآن میں مختلف النوع موضوعات پر ایسے بیانات دے جو اس کے اپنے زمانے سے متعلق نہیں اور پھر وہ ایسے امور سے مطابقت رکھتے ہیں جو کئی صدی بعد منکشف ہوئے میرے نزدیک قرآن کی کوئی انسانی توجیح ممکن نہیں[1]۔

---

[1] یہی قرآن کا دعویٰ اور کھلا چیلنج ہے۔ مترجم

قرآن کی صداقت

قرآن کے متن کی صحت وصداقت غیر متنازعہ فیہ ہے۔ اس بے الہامی کتابوں میں آپ بے مثال پوزیشن حاصل ہے۔ عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید اس کی ہمسری نہیں کرسکتے اس کتاب کے پہلے دو حصوں میں ان ترمیموں اور تحریفوں کا جائزہ لیا جا چکا ہے جو عہد نامۂ عتیق اور اناجیل میں ان کی موجودہ شکل میں آنے سے پہلے کی گئیں۔ قرآن پر یہ بات صادق نہیں آتی کیونکہ یہ خود پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے ہی میں احاطۂ تحریر میں آچکا تھا۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ کیسے لکھا گیا اور کیا طریقہ کار اختیار کیا گیا۔

قرآن اور بائبل میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں، ان کا باعث وہ سوالات نہیں ہیں جن کا تعلق بنیادی اور لازمی طور پر تعینِ زمانہ سے ہے۔ بعض لوگ ہمیشہ ایسے سوالات اٹھاتے رہتے ہیں اور وہ ان حالات کا کوئی لحاظ نہیں کرتے جو اُس زمانے میں پائے جاتے تھے جب یہودی عیسائی اور قرآنی تنزیلات تحریر میں لائی گئیں۔ وہ ان حالات کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے جو پیغمبر اسلامؐ پر قرآن کے نزول کے وقت پائے جاتے تھے۔ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک متن (قرآن) بغیر کسی تبدل و تحریف کے ہم تک پہنچ جائے بمقابلہ بعض دوسرے متنوں (عہد نامۂ عتیق) کے جو اس سے تقریباً پندرہ سو سال زیادہ پرانے ہیں۔ یہ رائے اگرچہ صحیح ہے تاہم اس بارے میں اسے کافی وشافی وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ بات زیادہ تر گزشتہ صدیوں میں یہودی، عیسائی مقدس کتابوں کے متنوں میں ترمیم وتحریف کے لیے معذرت خواہی کے طور پر کہی جاتی ہے اور اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ قرآن کا

متن جو نسبتاً حالیہ زمانے کا ہے اور کم پڑانا ہے، اسے انسان کے ہاتھوں ترمیم وتحریف کا اتنا خطرہ نہیں۔ جہاں تک عہد نامۂ عتیق کا تعلق ہے، اس کے ایک ہی کہانی بیان کرنے والوں کی محض تعداد ہی اتنی زیادہ ہے اور پھر قبل عیسائیت کے زمانے سے اس کی بعض کتابوں کے متنوں میں اس قدر ترمیم وتحریف ہوئی ہے کہ یہ دونوں باتیں اس کی نادرستی اور تضاد کا باعث بن گئی ہیں۔ جہاں تک اناجیل کا تعلق ہے، کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ان میں یسوع مسیحؑ کے الفاظ من وعن دیئے گئے ہیں یا جو کام انھوں نے کیے، ان کو صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور حقیقت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیسے مختلف اوقات پر تیار کیے جانے والے مختلف نسخوں کے متن میں صحت وصداقت سے غفلت برتی گئی نیز یہ کہ ان کے مصنف واقعات کے عینی شاہد نہ تھے۔

نیز قرآن جو وحیٔ مکتوب ہے اور احادیث، جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے افعال اور اقوال سے متعلق بیانات کا مجموعہ ہیں، کے باہمی فرق وامتیاز پر بھی توجہ دینی ہوگی۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعض اصحاب نے انؐ کی رحلت کے فوراً بعد انھیں احاطۂ تحریر میں لانا شروع کردیا تھا[1] چونکہ اس میں انسانی سہو وفروگزاشت کا عنصر شامل ہوجانے کا امکان ہوسکتا تھا، اس لیے بعد میں احادیث کے مجموعے نئے سرے سے تیار کیے گئے اور انھیں کڑی جرح و تعدیل کے عمل سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ اس عمل سے گزر کر جو مجموعے تیار ہوئے، انھیں بے حد وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن اناجیل کی طرح ان کے درجۂ صحت واستناد میں فرق ہے۔ کوئی ایک انجیل بھی خود مسیحؑ کی زندگی میں نہیں لکھی گئی (وہ سب کی سب ان کے دنیاوی مشن کے خاتمے کے مدتوں بعد لکھی گئیں) اسی طرح احادیث کا ایک بھی مجموعہ پیغمبرؐ کی زندگی میں مرتب نہیں ہوا۔[2]

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں بعض صحابہ نے لکھنا شروع کردیا تھا اور ان کے اعمال تدوین حدیث کی تاریخ میں ملتے ہیں۔ مترجم۔

[2] یہ درست ہے کہ آج جو مجموعہ ہائے حدیث ادل ہیں وہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد مرتب ہوئے لیکن بعض صحابہ نے اپنے ذاتی مجموعہ ہائے حدیث آپؐ کی زندگی میں تیار کیے تھے جن کی حیثیت ذاتی اور انفرادی تھی۔ مترجم

لیکن قرآن کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ جیسے جیسے وحی نازل ہوتی ویسے ویسے پیغمبر اسلامؐ اور ان کے متبعین آیتوں، سورتوں کو زبانی یاد کرتے گئے اور نمازوں میں ان کی تلاوت کیا کرتے، نیز ان کے مقرر کردہ کاتبانِ وحی اسے احاطۂ تحریر میں بھی لاتے گئے۔ لہٰذا قرآن کا آغاز صحت و استناد کے دو ایسے عناصر کے ساتھ ہوا جو اناجیل کو حاصل نہیں، پیغمبرؐ کے انتقال تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس زمانے میں جب کہ ہر شخص لکھنا نہیں جانتا تھا لیکن ہر شخص زبانی تلاوت کر سکتا تھا، تلاوت میں بڑا فائدہ تھا کیونکہ جب قرآن کا قطعی متن مرتب کیا گیا تو تلاوت کرنے والوں کی مدد سے اس کی دوہری جانچ پڑتال ممکن ہو سکی۔

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قرآن کی وحی فرشتۂ اعظم جبریلؑ کے ذریعے نازل ہوتی تھی۔ وحی کا سلسلہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی کے بیس سال سے زائد عرصے تک جاری رہا۔ اس کا آغاز سورہ نمبر ۹۶ (علق) کی ابتدائی آیات سے ہوا۔ بیچ میں تین سال تک یہ سلسلہ منقطع رہا اور پھر انؐ کی وفات (۶۳۲ء) تک بیس سال کے طویل عرصے تک وحی کا نزول ہوتا رہا یعنی، ہجرت (۶۲۲ء) سے دس سال پہلے اور دس سال بعد تک۔

سب سے پہلے سورۂ علق (نمبر ۹۶) کی یہ پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں۔[1]

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ [1]

ترجمہ:- پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس

---

[1] ان الفاظ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل و دماغ کو بے حد متاثر کیا بلکہ یہ ان کے دل و دماغ پر چھا گئے۔ ہم آگے چل کر ان کی تعبیر و تفسیر کریں گے خاص کر اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ مصنف

نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

پروفیسر حمید اللہ نے قرآن کا فرانسیسی زبان میں جو ترجمہ کیا ہے اس کے تعارف میں وہ لکھتے ہیں کہ اس ابتدائی موضوعات میں سے ایک موضوع "انسانی علم کے ایک ذریعے کی حیثیت سے قلم کی تعریف" بھی تھا۔ اس سے قرآن کو تحریری طور پر محفوظ کرنے کے لیے پیغمبرؐ کی فکروسور سمجھ میں آجاتی ہے۔"

قرآن کے متنوں سے یہ باقاعدہ طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے سے پہلے پیغمبرؐ پر جتنا قرآن نازل ہو چکا تھا، ہم دیکھیں گے کہ اس لحاظ سے قرآن کہاں تک معتبر اور مستند ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ماننے والے جو انہیں گھیرے رہتے تھے، قرآن کے نازل شدہ حصے زبانی تلاوت کیا کرتے تھے اس لیے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن میں کسی واقعے کا ذکر جو حقیقت سے بعید ہو کیونکہ پیغمبرؐ کے اصحاب خصوصاً کاتبانِ وحی اور دوسرے نقل کرنے والوں سے اس کی آسانی سے تصدیق کی جا سکتی تھی۔

ہجرتِ مدینہ (۶۲۲ء) سے پہلے کی چار مکی سورتوں میں قرآن کے تحریر میں لائے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً سورۂ عبس (آیات ۱۱ تا ۱۶) میں فرمایا گیا ہے:

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝

ترجمہ: ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرّم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں، معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں

عبداللہ یوسف علی نے اپنے ترجمۂ قرآن (۱۹۳۴ء) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس سے پہلے بیالیس یا پینتالیس سورتیں قلمبند کی جا چکی تھیں (یہ یاد رہے کہ قرآن کی کل سورتوں کی تعداد ۱۱۴ ہے)۔

اب لیجیے سورہ البروج (۸۵) کی آیات ۲۱، ۲۲:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝ ع [1]

ترجمہ: بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے۔ اس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے۔

اور سورۃ الواقعہ (۵۶) کی آیات ۷۷ تا ۸۰

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ: یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے، ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی نہیں چھو سکتا۔ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔

اسی طرح سورہ الفرقان (۲۵) کی پانچویں آیت!

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝

ترجمہ: کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں یہ شخص نقل کرتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔

یہاں پیغمبر اسلامؐ کے خلاف ان کے دشمنوں کے الزامات کا ذکر آگیا ہے جو انھیں (معاذ اللہ) جھوٹا سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہ افواہ پھیلادی تھی کہ کوئی دوسرا شخص انھیں پرانے زمانے کے قصے کہانیاں لکھواتا تھا اور وہ لکھتے جاتے تھے یا کسی سے لکھوا لیتے تھے (آیت میں استعمال شدہ لفظ اکْتَتَبَهَا کے معنی مختلف فیہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ کچھ بھی ہو، اس آیت میں قرآن کو تحریر میں لانے کا ذکر ہے جس کی خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں نے نشاندہی کی ہے۔

سورۃ البیّنہ (۹۸) ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس کی آیات ۲-۳ میں آخری بار ان اوراق کا ذکر ملتا ہے جن پر یہ خدا کی ہدایات (قرآن) لکھی گئی تھیں:

---

[1] قرآن کے معنی 'پڑھنا' بھی ہے۔ مصنف

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝

ترجمہ: یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔

اس لیے خود قرآن میں ایسے قرائن ملتے ہیں کہ خود محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں قرآن احاطۂ تحریر میں لایا جاچکا تھا۔ یہ ایک مسلّم امر ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں سے متعدد نے کاتب وحی کی حیثیت سے کام کیا جن میں سب سے مشہور زیدؓ بن ثابت تھے جن کا نام آنے والی نسلوں کے لیے یادگار رہ گیا۔

پروفیسر حمید اللہ نے اپنے فرانسیسی ترجمۂ قرآن (۱۹۷۱ء) کے دیباچہ میں ان حالات کی بڑی عمدہ تصویر کھینچی ہے جو قرآن کا متن قلمبند کرنے کے زمانے میں پائے جاتے تھے اور یہ حالات پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے انتقال تک موجود رہے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:

> اس پر تمام راویوں کا اتفاق ہے کہ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ یا ٹکڑا نازل ہوتا تھا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے کسی پڑھے لکھے صحابی کو بلاتے تھے اور اسے لکھواتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی ٹھیک ٹھیک بتادیتے تھے کہ اس ٹکڑے کو پہلے سے نازل شدہ قرآن میں کہاں رکھنا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ لکھواتے تھے، لکھوانے کے بعد کاتب سے پڑھ کر سنانے کو کہتے کہ اگر کتابت میں کوئی سہو ہوگیا ہو تو اسے درست کردیں'۔۔۔
>
> ۔۔۔۔ ایک دوسری مشہور روایت ہے کہ ہر سال رمضان کے مہینے میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نازل شدہ قرآن جبریل کو سناتے تھے۔۔۔۔
>
> اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے پہلے کے رمضان میں انھوں نے جبریل کو دو دفعہ قرآن سنایا۔۔۔
>
> ۔۔۔۔ یہ معلوم ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کے زمانے ہی سے معمول کی مقررہ نماز

عبادات کے علاوہ مسلمانوں میں رمضان کے مہینے میں شب بیداری کرنے اور پورے قرآن کی تلاوت کرنے کا رواج چلا آتا ہے۔ متعدد روایات میں یہ مزید کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتبِ وحی زیدؓ بن ثابت قرآن کے اس آخری موقع پر موجود تھے۔ متعدد دوسرے افراد کا بھی ذکر ملتا ہے۔"

اس پہلے جمع قرآن یعنی اسے احاطۂ تحریر میں لانے کے لیے مختلف قسم کی چیزیں استعمال کی گئیں۔ مثلاً جھلّی، چمڑا، چوبی تختیاں، اونٹ کے شانے کی ہڈی، نرم پتھر وغیرہ۔

لیکن اس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو قرآن زبانی یاد کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ نمازوں میں قرآن کی جن سورتوں کی تلاوت کی جاتی تھی، وہ انھوں نے زبانی یاد کر لیں اور ایسے بھی حفاظ تھے جنھوں نے سارا کا سارا قرآن زبانی یاد کر لیا تھا۔ انھوں نے اسے ہر طرف اور دوسرے ملکوں میں پھیلایا۔ قرآن کو ضبطِ تحریر میں لا کر اور زبانی یاد کر کے محفوظ کرنے کا دہرا طریقہ بے حد مفید ثابت ہوا۔

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے فوراً ہی بعد حضرت ابوبکرؓ نے انؐ کے سابق کاتبِ وحی زیدؓ بن ثابت کو قرآن کا ایک نسخہ تیار کرنے کو کہا۔ زیدؓ نے تعمیل کی۔ حضرت عمر بن خطاب کے کہنے سے زید بن ثابت نے ان معلومات سے استفادہ کیا جو انھیں مدینہ میں مل سکیں۔ مثلاً حفاظ کی شہادت، نجی طور پر لوگوں نے قرآن کی جو نقلیں مختلف چیزوں (جھلّی، چمڑا، ہڈی وغیرہ) اس ساری تگ و دو اور احتیاط کا مقصد یہ تھا کہ جمع و ترتیب قرآن میں کوئی غلطی نہ رہ جائے اس طرح قرآن کا ایک بے حد صحیح نسخہ مرتب کر لیا گیا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ (۶۳۴ء) نے بعد میں ایک جلد میں مصحف تیار کرایا جو انھوں نے محفوظ کر لیا اور اپنی وفات پر اپنی بیٹی (ام المومنین) حفصہؓ جو پیغمبرؐ کی بیوہ تھیں، کے حوالے کر دیا۔

حضرت عثمان نے ماہرین کا ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ تنقیح اور نظرِ ثانی کر کے ایک نسخۂ مصحف تیار کرے۔ اس طرح مصحفِ عثمانی تیار ہوا۔ ابوبکرؓ کے عہد میں قرآن کا جو نسخہ مرتب

ہوا تھا اور اب تک (ام المومنین) حفصہؓ کی تحویل میں چلا آتا تھا، مصحفِ عثمانی کی تدوین کے وقت اس کی جانچ پڑتال کی گئی۔ کمیشن نے ان مسلمانوں سے رجوع کیا اور ان سے صلاح و مشورہ کیا جنھیں قرآن حفظ تھا۔ متن کی صحت و درستی کا بڑی شد و مد سے تنقیدی تجزیہ کیا گیا۔ اگر کسی معمولی سی آیت کے نفسِ مضمون یا الفاظ کے متعلق ذرا سا بھی شک و شبہ ہوا تو اسے مصحف میں جگہ دینے سے پہلے اس بارے میں گواہوں کا متفق ہونا ضروری سمجھا گیا۔ یہ بات معلوم ہے کہ قرآن کی بعض آیات ہدایت و احکام کے متعلق دوسری آیات کی تصحیح کرتی ہیں۔ اگر اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ پیغمبر اسلامؐ کا تبلیغِ رسالت کا مشن بیس سال سے زائد عرصے پر محیط تھا، تو اس کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے اس جمع و تدوین کی مساعی کے نتیجے میں جو متن مرتب ہوا، اس میں سورتوں کی وہی ترتیب رکھی گئی جس ترتیب سے پیغمبر اسلامؐ خود رمضان کے مہینے میں پڑھتے تھے۔

سوچنے کی بات ہے کہ وہ کیا محرکات تھے جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ خاص کر حضرت عثمانؓ کو قرآن جمع کرنے اور اس کا نسخۂ مصحف تیار کروانے پر راغب کیا؟ اس کی وجوہات بہت سیدھی سادی ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ابتدائی دہوں میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلا اور ان قوموں نے بھی اسے قبول کیا جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ اس لیے یہ بالکل ضروری تھا کہ قرآن کے مستند اور مصدقہ متن کے نسخے لوگوں تک پہنچائے جائیں جو اصل کے عین مطابق ہوں۔ عثمانؓ کے عہد میں جو نظرِ ثانی اور تنقیح ہوئی، اس کا یہی مقصد تھا۔

عثمانؓ نے اس نسخۂ مصحف کی نقلیں اسلامی سلطنت کے تمام مراکز میں بھجوا دیں۔ پروفیسر حمیداللہ کے مطابق یہی وجہ ہے کہ آج بھی تاشقند اور استنبول میں قرآن کے ایسے نسخے موجود ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وہی ہیں جو عثمانؓ نے تیار کرائے تھے۔ دنیائے اسلام میں جو قدیم ترین نسخے پائے جاتے ہیں، وہ نقل کی ایک آدھ ممکنہ سہو کو چھوڑ کر بالکل ایک جیسے ہیں۔ یہی بات ان نسخوں پر بھی صادق آتی ہے جو یورپ میں محفوظ ہیں (بعض اجزا پیرس کے قومی کتب خانے میں بھی موجود ہیں۔ جو

ماہرین کی رائے میں آٹھویں اور نویں صدی عیسوی یعنی دوسری یا تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں)۔ بے شمار قدیم نسخے جو پائے جاتے ہیں، باہم متفق ہیں سوائے چند بہت ہی معمولی تبدیلیوں کے جن سے متن کے عام معانی و مطالب میں ہرگز کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر سیاق عبارت ایک سے زیادہ تعبیر و تشریح کی اجازت دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قدیم رسم الخط آج کے مقابلے میں زیادہ سیدھا سادہ تھا[1]۔

قرآن کی ۱۱۴ سورتوں کو ان کی بتدریج گھٹتی ہوئی طوالت کے لحاظ سے مرتب کیا گیا تھا لیکن بعض مستثنیات بھی تھیں[2]۔ زمانۂ نزول کی تاریخی ترتیب کو مد نظر نہیں رکھا گیا تھا۔ تاہم اکثر سورتوں کے بارے میں ان کی ترتیب نزول معلوم ہے۔ متن میں متعدد مقامات پر بہت سی بیانیہ عبارتیں ہیں جن میں بعض دفعہ (الفاظ و واقعات کا) اعادہ پایا جاتا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک بیان جو ایک جگہ نامکمل صورت میں آیا ہے دوسری جگہ ایک عبارت میں تفصیلات کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں بہت سے دوسرے مضامین کی طرح جدید سائنس سے متعلقہ باتیں بھی جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں اور درجہ بندی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

---

[1] مثلاً اعراب کے نہ ہونے سے ایک فعل معروف بھی پڑھا جا سکتا تھا اور مجہول بھی اور بعض دفعہ مذکر یا مونث بھی لیکن اکثر حالات میں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اکثر سیاق عبارت سے مطلب واضح ہو جاتا تھا۔ مصنف

[2] ملاحظہ فرمائیے "ضمیمہ" (ا)

آسمانوں اور زمین کی تخلیق

بائبل کے بیانات سے اختلافات اور مشابہات

عہد نامۂ عتیق کے برعکس قرآن میں کائنات کی تخلیق کا مکمل بیان ایک ہی جگہ نہیں دیا گیا۔ ایک مسلسل بیان کی بجائے قرآن میں مختلف مقامات پر بکھری ہوئی عبارات ملتی ہیں جو تخلیق کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں اور تخلیق کے سلسلے وار مراحل کے بارے میں بتاتی ہیں۔ کہیں کم تفصیل دی ہے اور کہیں زیادہ۔ تخلیق کے واقعات کی پیشکش کا ایک واضح تصور حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بہت سی سورتوں میں تخلیق کے متعلق جو ٹکڑے ملتے ہیں، وہ سب اکٹھے کر لیے جائیں۔

ایک ہی موضوع کے بارے میں بیانات کا پوری کتاب میں بکھرے ہوئے ہونا صرف تخلیق ہی سے مخصوص نہیں۔ قرآن میں بہت سے دوسرے اہم موضوعات کے بارے میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مثلاً ارضی یا سماوی مظاہر، یا انسان سے متعلق مختلف مسائل جو سائنسدانوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ یہاں کوشش کی گئی ہے کہ ان میں سے ہر موضوع کے بارے میں قرآنی آیات کو یکجا کر دیا جائے۔

بہت سے یورپی شارحین کے نزدیک قرآن میں تخلیق کا بیان بائبل کے بیان سے بہت مشابہ ہے اور وہ قرآن اور بائبل کے بیانات کو پہلو بہ پہلو رکھ دینے پر ہی قناعت کرتے ہیں۔ یہ تصور یقیناً غلط ہے کیونکہ بعض بہت نمایاں اختلافات موجود ہیں۔ بعض ایسے موضوعات ہیں جو سائنسی نقطۂ نظر سے کسی طرح بھی غیر اہم نہیں، ان کے بارے میں قرآن میں ہمیں ایسے بیانات ملتے ہیں جن کے مثل بائبل میں تلاش

کرنا بے کار ہوگا۔ موخر الذکر میں ایسے بیانات ملتے ہیں جن کے ہم معنی و مساوی بیانات قرآن میں نہیں پائے جاتے۔

دونوں کتابوں میں جو نمایاں مشابہتیں پائی جاتی ہیں وہ بخوبی معلوم ہیں۔ ان میں یہ امر واقعہ بھی ہے کہ پہلی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں تخلیق کے سلسلے وار مراحل کی تعداد یکساں ہے۔ یعنی بائبل کے چھ دن قرآن کے چھ دنوں سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن اصل میں یہ مسئلہ محض تعداد ایام کا نہیں بلکہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے اور یہاں اس کا جائزہ لینا مناسب ہے۔

تخلیق کے چھ ادوار

بائبل کے اس بیان میں کوئی ابہام و اشتباہ نہیں[1] کہ خدا نے کائنات کی تخلیق چھ دن میں مکمل کی اور ساتویں یعنی سبت کے دن آرام کیا۔ یہ سات دن ہفتے کے سات دنوں سے مشابہ ہیں۔ یہ دکھایا جا چکا ہے کہ کیسے چھٹی صدی قبل مسیح کے مذہبی پیشواؤں کے اس طرز بیان سے لوگوں کو سبت منانے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ تمام یہودیوں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ سبت کے دن آرام کریں[2] جیسا کہ خود خدا نے ہفتے کے چھ دن محنت کرنے کے بعد کیا۔

لفظ 'دن' کی بائبل جو تشریح کرتی ہے اس کا مطلب وقت کا وہ وقفہ ہے جو ساکنانِ زمین کے لیے سورج کے دو طلوعوں یا غروبوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جب دن کی یہ تعریف کی جائے تو وہ زمین کی محوری گردش سے متعین ہوتا ہے۔ منطقی نقطۂ نظر سے

[1] بائبل کے جس بیان کا ذکر کیا گیا ہے وہ نام نہاد مشائخی روایت (Sacerdotal version) سے لیا گیا ہے جس پر اس کتاب کے پہلے حصے میں بحث کی جا چکی ہے۔ بائبل کے موجودہ متداول نسخے میں نام نہاد یہوداتی روایت کا اختصار چند سطروں میں کر دیا گیا ہے۔ اس بیہودہ اس قدر غیر حقیقی اور ناکافی ہے کہ یہاں اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ مصنف

[2] عبرانی میں سبت کا مطلب ہے آرام کرنا۔ (مصنف)۔ اردو عہد نامۂ عتیق میں اب اس کا ترجمہ 'فارغ ہوا' کیا گیا ہے۔ (مترجم)

دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ اس تعریف کے مطابق 'دنوں' کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جس میکانیت سے ان کا ظہور ہوتا ہے۔ یعنی زمین کا وجود اور سورج کے گرد اس کی گردش بائبل کے بیان کے مطابق تخلیق کے ابتدائی مرحلوں میں وہ میکانیت ابھی متعین نہیں ہوئی تھی اس عدم امکان پر کتاب کے پہلے حصے میں زور دیا جا چکا ہے[1]۔

جب ہم قرآن کے اکثر تراجم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم پڑھتے ہیں کہ قرآن کے مطابق بھی تخلیق کا عمل چھ دن میں پورا ہوا اور یہ بیان بائبل کے بیان سے ملتا جلتا ہے مترجمین کو اس کے لیے قابل الزام قرار دینا مشکل ہے کہ انھوں نے عربی لفظ 'ایام' کا ایک عام ترین ترجمہ 'ڈیز' (Days) کر دیا۔ عام طور پر ترجموں میں ایسا ہی کیا جاتا ہے چنانچہ قرآن کی ساتویں سورت کی آیت ۵۴ کا حسب ذیل ترجمہ ہے:

Your Lord is God who created the heavens and the earth in six days.

(تمہارا خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔)

قرآن کے ایسے تراجم اور تفاسیر بہت ہی کم ہیں جن میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہو کہ لفظ 'ایام'[2] کا ترجمہ دراصل 'ادوار'[3] ہونا چاہیے۔ مزید براں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اگر قرآنی عبارات میں تخلیق کے مراحل کو 'ایام' (Days) میں تقسیم کیا گیا ہے تو ایسا عمداً کیا گیا ہے تاکہ اسلام کے ظہور کے وقت یہودیوں، عیسائیوں کے جو اعتقادات تھے انھیں اپنا لیا جائے اور تخلیق کے متعلق ان کے اس اعتقادِ عام سے کھلم کھلا تصادم نہ ہو۔

[1] بائبل کے بیان کے مطابق زمین کو خدا نے تیسرے دن اور سورج کو چوتھے دن پیدا کیا۔ تب تک زمین کا سورج کے گرد گھومنے کا سوال ہی نہ تھا اس لیے طلوع و غروب کی بنیاد پر دنوں کا شمار بھی نہ ہو سکتا تھا اور پھر جدید سائنس کی رو سے سورج پہلے پیدا ہوا اور زمین بہت بعد میں سورج ہی سے الگ ہو کر بنی، لہٰذا بائبل کے بیان کی غلطی ظاہر ہے۔ مترجم۔

[2] انگریزی میں ڈیز (Days)، [3] انگریزی میں پیریڈ (Period)۔ مترجم

اس انداز فکر و نظر کو مسترد کرنے کی خواہش کئے بغیر بھی اس مسئلے کو نسبتاً زیادہ گہری نظر سے دیکھا جا سکتا ہے اور خود قرآن ہی کی روشنی میں اس کی جانچ پرکھ کی جاسکتی ہے اور زیادہ عمومی حیثیت سے نزول قرآن کے عہد کی مروجہ عربی زبان کے لحاظ سے عربی زبان کے لفظ 'یوم' (جمع ایام) جس کا ترجمہ اب بھی مغربی مترجمین 'ڈے' (Day) کیے جا رہے ہیں، کے معنی متعین کیے جا سکتے ہیں۔

عام روزمرہ میں اس لفظ کے معنی دن (Day) ہی ہیں لیکن اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ اس کے معنی میں ایک دن کے غروب آفتاب سے دوسرے دن کے غروب آفتاب کی طوالت وقت سے زیادہ دن کی روشنی (Diurnal) کا مفہوم ہوتا ہے لیکن 'یوم' کی جمع 'ایام' کے معنی صرف دن (Days) ہی نہیں ہوتے بلکہ 'طویل امتداد زمانہ' بھی' ایک غیر معین عرصۂ وقت (لیکن ہمیشہ طویل)[1]۔ اس لفظ میں 'عرصۂ وقت' کے جو معنی شامل ہیں، وہ قرآن میں دوسری جگہ ملیں گے۔ چنانچہ سورہ ۳۲ (السجدہ) کی آیت ۵ میں آیا ہے کہ

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ○

ترجمہ: وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات میں تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے۔ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔ (یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اس سے پہلے کی چوتھی آیت میں ٹھیک ٹھیک بتایا گیا ہے کہ تخلیق کائنات کا عمل چھ ادوار میں تکمیل کو پہنچا)

سورہ ۷۰ (المعارج) کی آیت ۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

[1] عربی ادب میں 'ایام عرب' کی اصطلاح عام ہے جس کے معنی عرب کے زمانہ قدیم کے جنگی واقعات ہوتے ہیں۔ اردو میں عبدالحلیم شرر نے اسی عنوان سے عرب کے قبل اسلام کے واقعات و حالات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ 'ایام عرب' سے بھی عرب کی تاریخ کا غیر معین طویل عرصۂ وقت ہی مراد ہے۔ مترجم۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ○

ترجمہ: ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔)

اس حقیقت کی طرف ابتدائی مفسرین کی توجہ بھی گئی تھی کہ لفظ 'یوم' کا مطلب ایک ایسا عرصۂ وقت ہو سکتا ہے جو اس عرصۂ وقت سے مختلف ہو جو لفظ 'یوم' سے ہم مراد لیتے ہیں لیکن کائنات کی تخلیق و تشکیل کے مختلف ادوار کی طوالت کے متعلق جو معلومات اب ہمیں حاصل ہیں، انھیں حاصل نہ تھیں[2]۔ مثلاً سولھویں صدی عیسوی میں ابو السعود، جسے گردش زمین کی نسبت سے 'دن' کی ہیئتی تعریف کا کوئی تصور نہ تھا' اس کا خیال تھا کہ تخلیق کے عمل کی تقسیم اس طرح کرنی چاہیے جو مروج المعنی دنوں میں نہ ہو' بلکہ دفعات میں (عربی میں 'نوبہ')

جدید مفسرین نے اس تشریح و تاویل کی طرف رجوع کیا ہے۔ عبداللہ یوسف علی نے اپنی تفسیر (شائع شدہ ۱۹۳۴ء) میں تخلیق کائنات کے مراحل سے متعلق آیات کی تشریح کرتے وقت اس بات پر زور دیا ہے کہ ان آیات میں لفظ ایام سے عام دن[1] مراد نہیں بلکہ بہت طویل ادوار' زمانہ ہائے دراز یا جگ مراد ہیں۔

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی رو سے تخلیق کائنات چھ طویل ادوار میں ہوئی' جدید سائنس کی رو سے ابھی یہ مسلّمہ حقیقت نہیں کہ کائنات کی تخلیق و تشکیل جن پیچیدہ ادوار و مراحل سے گزری ان کی تعداد چھ تھی لیکن جدید سائنسی انکشافات اور معلومات کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ کائنات کی تخلیق و تشکیل ایسے طویل ادوار میں ہوئی جن کے مقابلے میں 'دن' جیسا کہ ہم انھیں سمجھتے ہیں مضحکہ خیز معلوم ہوں گے۔

[1] یعنی ایک طلوع آفتاب سے دوسرے طلوع آفتاب تک۔ مترجم

[2] اس لیے وہ 'ستۃ ایام' کی سائنسی تشریح و تعین نہ کر سکے۔ مترجم

قرآن کی طویل ترین عبارتوں میں سے ایک میں تخلیق کا بیان کرتے وقت اس کے ساتھ زمینی واقعات اور آسمانی واقعات کا بیان جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ سورہ حٰمٓ السجدہ (۴۱) کی آیات ۹ تا ۱۲ ہیں۔ ان میں خدا کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ سے خطاب ہے۔ ملاحظہ ہو:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ۝ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ڰ وَحِفْظًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝

ترجمہ: اے نبی ان سے کہو کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی سارے جہانوں کا رب ہے، اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا "وجود میں آ جاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا "ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح"۔ تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا۔ اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔

سورہ حٰمٓ السجدہ (۴۱) کی یہ چار آیات متعدد نکات کی حامل ہیں مثلاً مادۂ سماوی کا ابتداءً گیس دار ہونا اور آسمانوں کی تعداد ہفتگانہ کی بے حد سر یائی تعریف۔ اس عدد کے پس پردہ کارفرما معنویت کا ہم جائزہ لیں گے۔ خدا اور ابتدائی حالت کے آسمان اور زمین کا مکالمہ بھی رمزیہ نوعیت کا ہے۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اپنی تشکیل کے بعد زمین اور آسمان خدائی احکام کے مطیع و پابند ہو گئے۔

بعض ناقدین کو اس عبارت اور تخلیق کے چھ ادوار کے بیان میں تضاد نظر آتا ہے زمین کی تخلیق کے دو ادوار، ساکنانِ ارض کے لیے اس کے وسائل رزق کے پھیلاؤ کے چار ادوار اور آسمانوں کی تشکیل کے دو ادوار کو جمع کریں تو کل آٹھ ادوار ہو جاتے ہیں جو مذکورہ بالا ادوار سے متناقض ہیں۔

یہ قرآنی عبارت جو انسان کو خدا کی قدرتِ کاملہ پر غور و فکر کرنے پر مائل کرتی ہے کہ اس نے تخلیق کا آغاز زمین سے کیا اور آسمانوں پر ختم کیا، دراصل دو حصوں پر مشتمل ہے جو لفظ 'ثُمَّ' سے شروع ہوتے ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ کا ترجمہ 'More over' (علاوہ ازیں) کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے معنی 'پھر' اور 'تب' بھی ہوتے ہیں[1]۔ لہٰذا یہاں مذکورہ واقعات کا تسلسل یا ان واقعات سے متعلق انسانی غور و فکر کا سلسلہ و تواتر مراد ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پہلو بہ پہلو رکھے ہوئے واقعات کی طرف محض ایک اشارہ ہو اور اس سے یہ مراد نہ ہو کہ وہ یکے بعد دیگرے ظہور میں آئے۔ صورت واقعہ کچھ بھی ہو، آسمانوں کی تخلیق کے ادوار اور زمین کی تخلیق کے دو ادوار ہم زمان ہو سکتے ہیں یعنی تخلیق کے دونوں عمل پہلو بہ پہلو بھی جاری رہ سکتے ہیں۔ بیک وقت زمین بھی تخلیق ہو رہی ہو اور آسمان بھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ قرآن میں کائنات کی تخلیق کے بنیادی عمل کو کس طرح پیش کیا گیا ہے اور دیکھیں گے کہ کیسے یہ عمل جدید تصورات کے مطابق مشترکہ طور پر آسمانوں اور زمین پر لاگو ہو سکتا ہے۔ تب ہمیں معلوم ہو گا کہ یہاں

[1] اردو تراجم میں 'پھر' اور 'تب' ہی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مترجم

بیان کردہ واقعات کے ایک ساتھ ظہور میں آنے کا تصور انتہائی قرینِ عقل ہے۔

یہاں جس قرآنی عبارت کا اقتباس اور حوالہ دیا گیا ہے، اس میں اور قرآن کی دوسری عبارتوں میں، جن میں چھ ادوار میں تخلیق کائنات کا ذکر ہے، کوئی تناقض نہیں معلوم ہوتا۔

قرآن میں زمین اور آسمانوں کی تخلیق کے متعلق کسی تقدم وتاخر کا ذکر نہیں ملتا

قرآن سے جو دو اقتباس اوپر دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک (۷: ۵۴) میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر ہے جب کہ دوسری عبارت (۴۱: ۹-۱۲) میں زمین اور آسمانوں کی تخلیق کا۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے تقدم وتاخر کی تعیین نہیں کرتا کہ آسمان پہلے بنائے گئے یا زمین۔

ان آیات کی تعداد بہت قلیل ہے جن میں زمین کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ البقرہ (۲) کی انیسویں آیت اور سورہ طٰہٰ (۲۰) کی چوتھی آیت جس میں اس کی طرف اشارہ ہے "جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا"۔ اس کے برعکس ان آیات کی تعداد کافی زیادہ ہے جن میں آسمانوں کی تخلیق کا ذکر زمین سے پہلے کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ الاعراف (۷) آیت ۵۴، سورہ یونس (۱۰) آیت ۳، سورہ ہود (۱۱) آیت ۷، سورۂ الفرقان (۲۵) آیت ۵۹، سورۂ السجدہ (۳۲) آیت ۴، سورہ ق (۵۰) آیت ۳۸، سورۂ الحدید (۵۷) آیت ۴، سورہ النّٰزعٰت (۷۹) آیات ۲۷ تا ۳۳، سورہ الشمس (۹۱) آیات ۵ تا ۱۰۔

حقیقت یہ ہے کہ سورۂ النّٰزعٰت (۷۹) کے علاوہ قرآن میں کوئی دوسری ایسی عبارت نہیں ملتی جس میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے تقدم وتاخیر کا تعین پایا جاتا ہو۔ صرف ایک معمولی حرف عطف 'و' کے ذریعے دونوں الفاظ (السمٰوات والارض) کو جوڑ دیا گیا ہے یا اس غرض سے لفظ 'ثُمَّ' استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت میں، میرے خیال میں قرآن میں صرف ایک ہی ایسی عبارت ہے جس میں

تخلیق کے مختلف مراحل کا ترتیبی تقدم وتاخر صاف طور پر متعین کیا گیا ہے اور یہ سورۂ النّٰزعٰت کی آیات ۲۷ تا ۳۳ پر مشتمل ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

ترجمہ: کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اس کو بنایا، اس کی چھت خوب اونچی اٹھائی۔ پھر اس کا توازن قائم کیا اور اس کی رات ڈھانکی اور اس کا دن نکالا۔ اس کے بعد اس نے زمین کو بچھایا۔ اس کے اندر سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے۔ سامانِ زیست کے طور پر تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے۔

خدا نے انسان کو جن زمینی عطیات سے نوازا ہے، ان کی یہ فہرست ایک ایسی زبان میں ہے جو جزیرہ نمائے عرب کے کاشتکاروں اور بدوؤں کے مناسبِ حال ہے، اس سے پہلے کی عبارت میں آسمانوں کی تخلیق پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ خدا کے زمین کو بچھانے اور اسے قابلِ کاشت بنانے کے مرحلے کا ذکر ٹھیک اس موقع پر آیا ہے جب رات اور دن کے باری باری آنے کا انتظام ہو چکا ہے۔ اس لیے یہاں دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک تو آسمانی مظاہر کا اور دوسرے زمینی مظاہر کا جنھیں ان کے وقوع کے وقت سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہاں ان کا جس طرح ذکر آیا ہے اس لیے یہ در ہوتا ہے کہ بچھائے جانے سے پہلے ضروری ہے کہ زمین موجود ہو اور جب خدا نے آسمانوں کو پیدا کیا تو زمین اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس لیے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ زمین اور آسمانوں کے ارتقا کے مرحلے باہم دگر گتھے ہوئے اور لازم و ملزوم ہیں۔ زمینی اور آسمانی مظاہر آپس میں جڑے ہوئے سے ہیں۔ لہٰذا قرآن میں زمین کے آسمانوں سے پہلے پیدا کیے جانے یا آسمانوں کے زمین سے پہلے بنائے

جانے کے بیان کو کوئی خصوصی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ الفاظ کی ترتیب سے تخلیق کی ترتیب متاثر نہیں ہوتی تاوقتیکہ خصوصی طور پر اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

تشکیل کائنات کا بنیادی عمل اور اس سے منتج ہونے والی ترکیبِ عوالم

قرآن نے دو آیتوں میں ان مظاہر کے تعرّف و امتزاج کا مختصراً ذکر کیا ہے جن پر تشکیلِ کائنات کا بنیادی عمل مشتمل ہے:

سورۃ الانبیاء (۲۱) آیت ۳۰:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ○

ترجمہ: کیا وہ لوگ جنھوں نے (اپنے نبی کی بات ماننے سے) انکار کردیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ کیا وہ (ہماری خلاقی کو) نہیں مانتے؟

سورۃ حٰمٓ السجدۃ (۴۱) کی آیت ۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ○

ترجمہ: پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا "وجود میں آجاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا "ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح"۔

پانی کے سرچشمۂ زندگی ہونے کے موضوع کی طرف ہم پھر لوٹ کر آئیں گے اور قرآن میں جو دوسرے حیاتیاتی مسائل اٹھائے گئے ہیں ان کے ساتھ اس کی بھی

تحقیقات کریں گے۔ سرِدست یاد رکھنے کی ضروری باتیں یہ ہیں:-

(ا) تودۂ گیس کا وجود جس میں مہین ذرات شامل ہوں، کیونکہ 'دھواں' (عربی 'دخان') کا مطلب یہی ہوسکتا ہے۔ عام طور پر دھواں ایک گیس دار زیریں پرت (Substratum) اور معلق مہین ذرات پر مشتمل ہوتا ہے جو کم و بیش ٹھوس حالت میں ہوتے ہیں اور اونچے یا نیچے درجۂ حرارت پر مادے کی ٹھوس یا مائع حالت سے متعلق ہوتے ہیں۔[1]

(ب) ایک بنیادی تودۂ واحد کی علیحدگی کا عمل (فتق) جس کے عناصر ابتدا میں باہم ملے ہوئے تھے (رتق)۔ یہ ذہن میں رہے کہ عربی میں 'فتق'، 'توڑنے بکھیرنے' الگ الگ کرنے کے عمل کو کہتے ہیں اور 'رتق' اجزا کو باہم ملانے یا ایک ساتھ باندھنے کے عمل کو کہتے ہیں تاکہ ایک یکرنگ اور متجانس کل متشکل ہوسکے۔[2] ایک کُل کو متعدد اجزا میں الگ الگ کرنے کا یہ تصور قرآن کی دوسری جگہوں میں بھی ملتا ہے جہاں متعدد دنیاؤں کا ذکر آیا ہے۔ قرآن کی سب سے پہلی آیت کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ○ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○

ترجمہ: اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

'عالمین' (عالم کی جمع، دنیائیں۔ بہت سے جہاں) کا لفظ قرآن میں درجنوں دفعہ آیا ہے۔ آسمانوں کا ذکر بھی جمع (سمٰوات) کی صورت میں آیا ہے، صرف متعدد ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ سات کے عددی رمزیت کی وجہ سے بھی۔

مختلف اعدادی مقادیر کے لیے یہ عدد (۷) قرآن میں چوبیس دفعہ استعمال ہوا ہے، اکثر اس سے مراد متعدد یا بہت سی

[1] ملاحظہ فرمائیے ضمیمہ ب

تعداد ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم ٹھیک طور پر نہیں جانتے کہ اس عدد کے یہ معنی کیوں لیے گئے۔ یونانیوں اور رومیوں نے بھی اس عدد کو غیر معین کثرت تعداد کا تصور دینے کے لیے استعمال کیا ہے۔ قرآن میں سات کا عدد خود آسمانوں (سمٰوٰت) کے لیے استعمال ہوا ہے۔ صرف یہی وہ عدد ہے جس کا مطلب "آسمان" (جمع کی صورت میں) ہوتا ہے۔ آسمانوں کے سات راستوں (سبع طرائق) کا ذکر صرف ایک دفعہ آیا ہے۔[1]

سورۃ البقرہ (۲) کی آیت ۲۹ دیکھئے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔ پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

سورۃ المومنون (۲۳) آیت ۱۷:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِينَ ۝

ترجمہ: اور تمہارے اوپر ہم نے سات راستے بنائے اور مخلوقات کی طرف سے ہم غافل نہیں ہیں۔

سورۃ الملک (۶۷) آیت ۳:

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ۖ مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ ۖ

---

[1] سات کا عدد فارسی میں بھی کثرت یا بڑی تعداد کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً "ہفت زبان" بہت سی زبانیں جاننے والا۔ "ہفت اقلیم" یعنی ساری دنیا "ہفت رنگ" بہت سے رنگوں سے مرکب۔ نیز شیخ سعدیؒ کے اس شعر میں "ہفت ملت" سے بے شمار ملتیں یا قومیں مراد ہے۔

کہ ناکردہ قرآں درست — کتب خانہ ہفت ملت بشست

اردو میں سات سمندر پار بھی بہت زیادہ فاصلے کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی طرح محاورہ "سات پردوں میں چھپا کر رکھنا" بمعنی نہایت حفاظت سے رکھنا نیز "سات آر دہن" بمعنی گردہ۔ جمع کے ہے — مترجم

...رْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ۝

ترجمہ: جس نے تہہ بہ تہہ سات آسمان بنائے۔ تم رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی ...ربطی نہیں پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو کیا تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟

سورہ نوح (۷۱) آیات ۱۵-۱۶:

...لَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ۝ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝

ترجمہ: کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بہ تہہ بنائے اور ...میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔[1]

سورۃ النبا (۷۸) آیات ۱۲-۱۳

...وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝

ترجمہ: اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ہر ایک کو روشن چراغ بنایا۔

...ں روشن چراغ سے مراد سورج ہے۔

مفسرین ان تمام آیات کے بارے میں متفق الرائے ہیں کہ ان میں سات کے عدد ...سے کثرت مراد ہے۔[2]

لہذا اسمان کثیر التعداد ہیں اور زمینیں بھی۔ اور قرآن کے قاری کو [illegible] ہے

---

[1] ...یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ بائبل میں چاند اور سورج دونوں کو نور کہا گیا ہے لیکن قرآن میں الگ ...لف نام دیے گئے ہیں۔ آیت ہذا میں اول الذکر کو نور کہا گیا ہے اور ثانی الذکر کو چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے ...ور روشنی پیدا کرتا ہے۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ سورج کو دوسرے توصیفی نام بھی دیے گئے ہیں۔ (مصنف)

[2] قرآن کے علاوہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے سے یا ان ...کے بعد کی ابتدائی صدیوں کی تحریروں میں، جن میں ان کے اقوال (حدیث) درج ...ہیں، اکثر سات کا عدد بڑی تعداد کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ (مصنف)

بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ہماری زمین کی طرح اس کائنات میں اور زمینیں بھی ہوں گی ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ انسان ابھی تک اس کی تصدیق نہیں کر سکا۔

تاہم سورۃ الطلاق (۶۵) کی بارھویں آیت میں یہ پیشین گوئی کی گئی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ۬ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا۠

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ (یہ بات تمہیں اس لیے بتائی جا رہی ہے) تاکہ تم مان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔

چونکہ سات کا عدد ایک غیر معین کثرت کا مظہر ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں)، اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن واضح طور پر ایک سے زیادہ زمینوں کے وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی ہماری زمین کی طرح کائنات میں اور بھی زمینیں ہیں[1]۔

ایک اور بات جس پر بیسویں صدی کے قارئین قرآن کو حیرت ہوگی، یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی میں خدا کی پیدا کردہ چیزوں کے تین گروپوں کا ذکر ملتا ہے

۱۔ وہ چیزیں جو آسمانوں میں ہیں۔

۲۔ وہ چیزیں جو زمین پر ہیں۔

۳۔ وہ چیزیں جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہیں۔

اس سلسلے میں حسبِ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے:

سورۃ طٰہٰ (۲۰) آیت ۶:

[1] یہاں شاعرِ اسلام اقبالؒ کی وہ غزل یاد آتی ہے جس کا مطلع ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — زمیں اور بھی آسماں اور بھی ہیں (مترجم)

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی۝

ترجمہ: جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ دونوں کے بیچ میں ہے اور جو کچھ زمین کے نیچے ہے، سب اسی کا ہے۔

سورہ الفرقان (۲۵) آیت ۵۹:

الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ

ترجمہ: وہ جس نے چھ دنوں (ادوار) میں زمین کو اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو بنایا

سورۃ السجدۃ (۳۲) آیت ۴:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ

ترجمہ: اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیے۔

سورۃ ق (۵۰) آیت ۳۸:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖۗ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۝

ترجمہ: ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان ساری چیزوں کو چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی[1]

آسمانوں اور زمین کے درمیان پائی جانے والی چیزوں' کا حوالہ قرآن کی حسبِ ذیل آیات میں بھی ملتا ہے:

[1] قرآن کا یہ بیان کہ کائنات کی تخلیق کے کام نے اللہ کو تھکایا نہیں، صاف طور پر بائبل کے اس بیان کے جواب میں ہے جس کا حوالہ اس کتاب کے پہلے حصے میں دیا جا چکا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے چھ دن میں کائنات کی تخلیق کی اور ساتویں دن آرام کیا (گویا تکان دور کرنے کے لیے) مصنف

۲۱:۱۶، ۴۴:۷ اور ۳۸، ۷۸:۲۷، ۱۵:۸۵، ۴۶:۳، ۴۳:۸۵

آسمانوں اور زمین سے باہر کی اس مخلوق جس کا ذکر قرآن میں متعدد بار آیا ہے کا تصور کرنا مشکل ہے، ان آیات کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ کائنات میں کہکشاں سے مستزاد مواد کی موجودگی کے متعلق تازہ ترین انسانی مشاہدات و آرا کی طرف رجوع کیا جائے اور کائنات کی تشکیل کے متعلق جدید سائنس نے جن خیالات و تصورا کی تصدیق کی ہے ان کا حوالہ دیا جائے۔ اس طرح کہ سہل ترین سے شروع کر کے پیچید ترین کی طرف بڑھا جائے۔

تاہم ان خالصتاً سائنسی امور کی طرف رجوع کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ تخلیق کے متعلق قرآن جو معلومات فراہم کرتا ہے، اس کے بڑے بڑے نکات کا سرخیوں کی صورت میں یہاں خلاصہ دے دیا جائے، چنانچہ محولہ بالا اقتباسات کی رو سے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ تخلیق کے چھ ادوار

۲۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے باہم کٹتے ہوئے مرحلے۔

۳۔ اولیں ابتدائی نوعیت کی کمیت مادہ، جو بعد میں ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے کائنات کی تخلیق۔

۴۔ آسمانوں اور زمینوں کا متعدد ہونا۔

۵۔ آسمانوں اور زمین کے مابین ایک درمیانی مخلوق کا وجود۔

کائنات کی تشکیل کے بارے میں کچھ

جدید سائنسی معلومات

نظام شمسی

زمین اور سیارے جو سورج کے گرد گھومتے ہیں، ابعاد کی ایک منظم دنیا ہیں۔ یہ ابعاد (لمبائی، چوڑائی اور موٹائی یا گہرائی) انسانی پیمانے کے لحاظ سے بے حد عظیم ہیں۔ زمین سورج سے تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ انسان کی نظر میں یہ بہت بڑا فاصلہ ہے۔ لیکن نظام شمسی کے دور ترین سیارے (پلوٹو) اور سورج کے مابین جو فاصلہ ہے، اس کے مقابلے میں یہ بہت ہی کم ہے۔ یوں سمجھئے کہ سورج اور پلوٹو کا درمیانی فاصلہ سورج اور زمین کے درمیانی فاصلے سے تقریباً چالیس گنا ہے یعنی تقریباً تین سو ستر کروڑ بیس لاکھ میل۔ اگر اس فاصلے کو دگنا کر دیا جائے تو یہ نظام شمسی کے سب سے بڑے بُعد کو ظاہر کرے گا۔ سورج کی روشنی کو پلوٹو تک پہنچنے میں تقریباً چھ گھنٹے لگتے ہیں اور روشنی کا یہ سفر ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی ہولا دینے والی رفتار سے ہوتا ہے اس لیے معلومہ سماوی دنیا کی آخری حد پر واقع ستاروں کی روشنی کو ہم تک پہنچنے میں اربوں کھربوں سال لگتے ہیں۔

کہکشائیں

سورج کے ارد گرد کے دوسرے سیاروں کی طرح ہماری زمین بھی اس کا ایک ذیلی سیارہ ہے۔ لیکن خود سورج ان کھربوں ستاروں کے درمیان ایک بہت ہی چھوٹا سا عنصر ہے۔ ان کھربوں ستاروں کے جگمگٹے کو کہکشاں (Galaxy) کہتے ہیں۔

گرمیوں کی راتوں[1] کو جب آسمان گرد و غبار، دھوئیں، بادلوں وغیرہ سے صاف ہوتا ہے تو پوری فضا ستاروں سے بھری ہوتی ہے (اور فضا میں ایک دودھیا سا راستہ بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دراصل دور دراز کے تارے ہوتے ہیں جو الگ الگ دکھائی دینے کے بجائے گڈمڈ دکھائی دیتے ہیں۔ مترجم) اسے کہکشاں (Milky way) کہتے ہیں۔ ستاروں کا یہ گروہ بے حد بڑے ابعاد رکھتا ہے۔ روشنی نظام شمسی سے ایک ایک گھنٹے کی اکائیوں میں گذر سکتی ہے لیکن تاروں کے اس انتہائی پیوستہ اور تہہ بہ تہہ گروہ۔ ہماری کہکشاں (Galaxy) ۔ کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچنے کے لیے روشنی کو تقریباً نوے ہزار سال درکار ہوں گے۔

جس کہکشاں (Galaxy) سے ہمارا تعلق ہے اگرچہ وہ ناقابلِ یقین حد تک وسیع و عریض ہے، تاہم وہ آسمانوں کا ایک بہت ہی چھوٹا جزو ہے۔ ستاروں کے بے حد عظیم اجتماع ایسے بھی ہیں جو ہماری کہکشاں سے باہر واقع ہوئے ہیں[2] ان کا انکشاف پچاس سال سے کچھ زائد عرصہ پہلے اس وقت ہوا جب ہیئت دان نازک اور ترقی یافتہ بصری آلات استعمال کرنے کے قابل ہوگئے۔ مثلاً ایسے آلات جن کی مدد سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ماونٹ وِلسن پر دوربین کی تعمیر ممکن ہوسکی[3] اس طرح الگ تھلگ اکیلی دکیلی کہکشاںوں اور کہکشاںوں کے جھرمٹوں کی ایک بڑی تعداد معلوم کی جاچکی ہے جو اس قدر دور واقع ہیں کہ نوری سالوں کی ایک خصوصی اکائی قائم کرنا ضروری ہوگیا جسے 'پاریک' (Parsec) کہتے ہیں۔ (یعنی وہ فاصلہ جو روشنی ۳٫۲۶ سالوں میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے

---

[1] پاکستان میں عموماً سردیوں کی راتوں کو بھی۔ مترجم

[2] ملاحظہ فرمایئے: ضمیمہ ب

[3] ماونٹ وِلسن کی دوربین کے شیشے کا قطر ۱۰۰ انچ اور ماونٹ پالومر کا ۲۰۰ انچ ہے دونوں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہیں۔ مترجم

سے طے کرتی ہے[4]

کہکشاؤں، ستاروں اور نظام ہائے سیارگان کی تشکیل اور افکار[1]

جس وسیع و عریض فضا میں اب کہکشائیں پائی جاتی ہیں، وہاں پہلے کیا تھا؟ اس کا جواب جدید سائنس کائنات کے ارتقا کے ایک غیر معین دور کے بارے میں دے سکتی ہے لیکن اس دور اور ہمارے دور کے درمیان جو طویل مدت حائل ہے اس کی تعیین نہیں کرسکتی۔

جس قدیم ترین دور کے متعلق جدید سائنس معلومات فراہم کرتی ہے، اس کے متعلق ان معلومات کی روشنی میں یہ دعویٰ کرنا سراسر قرینِ عقل ہے کہ اس وقت کائنات ایک تودۂ گیس (Gaseaus Mass) تھی جو زیادہ تر ہائیڈروجن اور کچھ ہیلیم (Helium) پر مشتمل تھی اور آہستہ آہستہ گردش کناں۔ بعد میں یہ سدیم (Nebula) پھٹ کر متعدد بڑے بڑے عظیم الابعاد ٹکڑوں میں بٹ گیا جو اتنے بڑے تھے کہ فلکی طبیعیات (Astrophysics) کے تخمینہ کے اندازے کے مطابق وہ سورج کی موجودہ کمیت مادہ سے دس کھرب (۱ .. ..) سے لے کر ہزار کھرب (۱۰ ... ...) گنا بڑے تھے (جب کہ سورج کی کمیت مادہ زمین سے تین لاکھ گنا بڑی ہے۔) ان ہندسوں سے ہمیں اس ابتدائی گیسی مادے کے ان بڑے بڑے ٹکڑوں کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جن سے کہکشاؤں نے جنم لیا۔

اس ابتدائی کمیت مادہ سے مزید حصے علیحدہ ہوکر ستاروں کی صورت اختیار کرگئے۔ تب انجماد کا عمل دخل انداز ہوا اور مقناطیسی میدانوں اور اشعاعیات (Radiations۔) کے دباؤ اور اثرات کے ہمراہ کشش ثقل کی قوتیں اپنا کام کرنے لگیں۔ (کیونکہ یہ اجسام زیادہ سے زیادہ تیزی سے حرکت اور گردش کر رہے تھے۔) سکڑنے سے ستاروں میں چمک پیدا ہوگئی اور انھوں نے کشش ثقل کی قوتوں کو حرارتی

توانائی میں تبدیل کر دیا۔ حرارتی نیوکلیائی ردعمل رونما ہوا اور ہلکے ایٹموں کے انضمام و ادغام سے نسبتاً زیادہ بھاری ایٹم متشکل ہوئے۔ اس طرح ہائیڈروجن سے ہیلیم اور پھر کاربن اور آکسیجن پیدا ہوئے اور انجام کار دھاتیں اور دھات نما مادے وجود میں آ گئے۔

یوں ستاروں کی اپنی زندگی ہے اور جدید علم ہیئت ان کے موجودہ مرحلۂ ارتقاء کے مطابق ان کی نوع بندی کرتا ہے۔ ستاروں کی موت بھی واقع ہوتی ہے۔ ارتقاء کے آخری مرحلے میں بعض ستاروں میں زبردست اندرونی فشار اور ٹوٹ پھوٹ کا مشاہدہ کیا گیا ہے جس سے وہ بالکل 'مردہ لاشیں' ہو کر رہ گئے۔

سیاروں' خاص کر زمین' کی ابتدا ایک عمل علیحدگی سے ہوئی' اور یہ عمل ایک ایسے بنیادی عنصر سے شروع ہوا جو ابتدا میں قدیم ترین سدیم (Nebula) تھا' اس حقیقت کو گزشتہ پچیس سال سے زائد عرصے میں کسی نے چیلنج نہیں کیا کہ سورج ایک ہی سدیم کے اندر منجمد ہو گیا اور اسی طرح سیارے بھی اپنے چاروں طرف محیط 'سدیمی' قرص (Nebular disc) کے اندر منجمد ہو گئے۔ یہ نکتہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ نہ تو سورج ایسے اجرامِ سماوی کے اجزائے ترکیبی کی تشکیل میں کوئی سلسلہ وار ترتیب ملحوظ رکھی گئی اور نہ ارضی عنصر کی تشکیل میں۔ بلکہ ان کی اصل کی یکسانیت میں ایک ارتقائی متوازیت پائی جاتی ہے۔

جس دور میں مذکورہ بالا واقعات ظہور پذیر ہوئے' اس کے متعلق سائنس ہمیں معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ جس کہکشاں میں ہمارا نظامِ شمسی واقع ہوا ہے' اس کی عمر کا اندازہ تقریباً سو کھرب سال لگایا گیا ہے اور ہمارے نظامِ شمسی کی تشکیل اس کے تقریباً پچاس کھرب سال بعد ہوئی۔ قدرتی ریڈیائی تابکاری کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا ممکن ہو گیا ہے کہ زمین کی عمر اور سورج کی تشکیل کا زمانہ تقریباً پینتالیس کھرب سال ہے۔ بعض سائنس دانوں کے حساب کے مطابق اس میں دس کروڑ سال کا فرق ہو سکتا ہے۔ حسابی اندازوں کی یہ صحت قابلِ تعریف ہے کیونکہ اگرچہ دس کروڑ سال ہمیں ایک طویل مدت معلوم ہوتے ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ غلطی اور مجموعی قابلِ پیمائش وقت

میں اعشاریہ ایک (۰٫۱) اور چار اعشاریہ پانچ (۴٫۵) کا تناسب ہے یعنی اس طویل و عظیم حسابی تخمینے میں صرف دو اعشاریہ دو فیصد (۲٫۲ فیصد) غلطی کا امکان ہے۔

اس لیے فلکی طبیعیات (Astrophysics) کے متخصصین نظامِ شمسی کی تشکیل کے عمومی عمل کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل کر چکے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

گردش کناں تودۂ گیس کا انجماد اور سکڑاؤ' اس کا ٹکڑوں میں بٹ جانا اور سورج اور سیاروں کا اپنی اپنی جگہ پر رہ جانا' زمین بھی ان میں شامل ہے[1]۔ ابتدائی سدیم اور اس کے ٹوٹ پھوٹ کر بے شمار ستاروں کی صورت اختیار کرنے اور پھر ان کے گروپوں کا کہکشاؤں کی صورت میں متشکل ہونے کے عمل کے متعلق جو سائنسی معلومات حاصل ہوئی ہیں' ان سے ایک سے زیادہ دنیاؤں کے وجود کے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

نظام اپنا لیے پھرتا ہے کیا خورشید نور افشاں
ہزاروں ایسی دنیاؤں کو شامل ہے نظام اس کا — ظفر علی خاں

لیکن اس سے یہ یقینی شہادت فراہم نہیں ہوتی کہ کائنات میں کوئی ایسی چیز بھی موجود ہے جو زمین سے قریبی یا مبہم مشابہت رکھتی ہو۔

کثرتِ عوالم کا تصور

اس کے باوجود فلکی طبیعیات کے جدید ماہرین کی رائے میں کائنات میں زمین سے مشابہ سیاروں کی موجودگی کا بڑا امکان ہے۔ جہاں تک نظامِ شمسی کا تعلق ہے' کسی کے خیال میں بھی اس کا امکان نہیں کہ زمین کی مانند عمومی احوال و کیفیات کا حامل کوئی دوسرا سیارہ موجود ہو۔ اس لیے ہمیں ایسے سیاروں کی تلاش اس نظامِ شمسی سے باہر کرنی

---

[1] جہاں تک چاند کا تعلق ہے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ زمین کی گردشِ محوری شروع ہونے کے بعد زمین سے بتدریج الگ ہوا۔ مصنف

چاہیے۔ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر نظام شمسی سے باہر ایسے سیاروں کی موجودگی کو ممکن خیال کیا جاتا ہے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہماری کہکشاں کے ایک ہزار کھرب ستاروں میں سے آدھے سورج کی طرح اپنا اپنا نظام سیارگاں ضرور رکھتے ہیں۔ یقیناً پانچ سو کھرب ستارے سورج کی طرح بہت آہستہ آہستہ گردش کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد گھومنے والے ذیلی سیاروں (Satellites) سے گھرے ہوئے ہیں۔ یہ ستارے ہم سے اس قدر دور واقع ہوئے ہیں کہ ان کے ذیلی سیارے مشاہدے میں نہیں آتے لیکن خط حرکت کی بعض خصوصیات (Trajectory characteristics) کی بنا پر ان کی موجودگی کو بہت ممکن سمجھا جاتا ہے۔ ستارے کے خط حرکت میں معمولی سا تموج یا انحراف (Undulation) بھی کسی ذیلی سیارے کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح ستارہ برنارڈ کم سے کم ایک ذیلی سیارہ رکھتا ہے جو حجم میں مشتری سے بھی بڑا ہے۔ دو ذیلی سیاروں کا بھی امکان ہے۔ پی گورین (P. Gueron) لکھتا ہے کہ "سب شہادتیں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ساری کائنات میں نظام ہائے سیارگاں کثیر تعداد میں بکھرے پڑے ہیں۔ نظام شمسی اور زمین اپنی خصوصیت میں بے مثال نہیں۔" اس کا ضمنی نتیجہ یہ ہے کہ "اپنے حامل سیاروں کی طرح زندگی بھی جہاں جہاں اس کی نشوونما کے لیے سازگار طبیعیاتی۔کیمیائی حالات موجود ہیں، ساری کائنات میں بکھری پڑی ہے۔"

بین الکواکبی ہیولی

لہٰذا کائنات کی تشکیل کا بنیادی عمل یہ تھا کہ ابتدائی سدیم کے اندر مادی ہیولی منجمد ہو اور پھر ایسے اجزا میں منقسم ہو جائے جن سے ابتداً دور تک پھیلے ہوئے کہکشانی سلسلوں نے ترکیب پائی۔ موخرالذکر اپنی باری پر ٹکڑے ہو کر ستاروں میں بٹ گئے اور ستاروں کی ذیلی پیداوار تھے سیارے۔ یہ یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہونے والی علیحدگیاں

اہم ترین عناصر ترکیبی کے گروہوں میں اپنے 'باقیات' چھوڑ گئیں جنھیں بین الکواکبی کہکشانی ہیولی کا سائنسی نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کا بیان مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے۔ کچھ روشن سدیم ہیں جو دوسرے ستاروں سے آنے والی روشنی کو منعکس کرتے ہیں اور ہیئتی طبیعیات کے ماہرین کی اصطلاح میں شائد گرد وغبار اور دھوئیں سے مرکب ہیں۔ اور پھر تاریک سدیم بھی ہیں جو نسبتاً کم گاڑھے اور گھنے ہیں اور ایسے بین الکواکبی مواد پر مشتمل ہیں جو اور بھی زیادہ معمولی نوعیت کا ہے اور ہیئتی نقطۂ نظر سے اس میں نور پیمائی (Photometric measurements) کا رجحان پایا جاتا ہے۔ خود کہکشاؤں کے درمیان ہیولائی پلوں' (bridges of material) کی موجودگی کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اگرچہ یہ گیسیں بہت ہلکی ہو سکتی ہیں، تاہم چونکہ کہکشاؤں کے درمیان پائے جانے والے طویل فاصلوں کی وجہ سے انھوں نے بے حد زیادہ جگہ گھیر رکھی ہے، اس لیے کم کثافت کے باوجود ان کی کمیت مادہ کہکشاؤں کی مجموعی کمیت مادہ سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ اے بوئکو (A. Boichot) کی نظر میں یہ بین کہکشائی کمیتی تودے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جو کائنات کے ارتقا کے متعلق تصورات کو خاصا بدل سکتے ہیں۔"

کائنات کی تخلیق کے متعلق جو قرآنی تصورات ہم نے پیش کیے ہیں۔ اب ہم ان پر جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں۔

کائنات کی تخلیق کے متعلق قرآن کی فراہم کردہ معلومات کا سائنسی تجزیہ

تخلیق کے سلسلے میں قرآن جن پانچ اہم اور مرکزی نکات کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔ اب ہم ان کی جانچ پرکھ کرتے ہیں:

۱۔ قرآن کی رو سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے چھ ادوار اجرام سماوی اور زمین کی تشکیل اور موخرالذکر کی نمو اس کے سامان رزق و غذا کے اس حد تک نشوونما پر مشتمل ہیں کہ وہ انسان کے رہنے کے قابل بن گئی۔ زمین کے سلسلے

میں قرآن نے جو حالات و واقعات بیان کیے ہیں وہ چار ادوار میں وقوع پذیر ہوئے شاید یہی جدید سائنس کے بیان کردہ چار ارضیاتی ادوار ہیں اور جیسا کہ ہم پہلے ہی جانتے ہیں انسان کا ظہور اس چوتھے ارضیاتی دور میں ہوا لیکن یہ صرف ایک مفروضہ اور بے دلیل دعویٰ ہے کیونکہ اس سوال کا حتمی جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا۔

لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جیسا کہ سورہ حٰم السجدہ (۴۱) کی آیات ۹ تا ۱۲ (اوپر گزر چکیں، دیکھیے صفحہ) میں مذکور ہوا، اجرام سماوی اور زمین کی تشکیل دو مرحلوں میں ہوئی۔ اگر ہم سورج اور اس کی ذیلی پیداوار زمین کی مثال لیں (اور صرف اسی تک ہماری رسائی ہے) تو سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ ان کی تشکیل بنیادی سدیم کے انجماد تکاثف کے عمل سے ہوئی اور پھر ان کی ایک دوسرے سے علیحدگی کا عمل بروئے کار آیا۔ بالکل یہی بات ہے جو قرآن بڑے واضح الفاظ میں بتاتا ہے جب وہ ان مرورات کا ذکر کرتا ہے جو سماوی 'دھوئیں' سے شروع ہوئے اور سدیموں کے آمیزش و اتحاد اور پھر متشکلہ اجرام کی علیحدگی کا باعث بنے۔ لہٰذا قرآنی حقائق اور سائنسی حقائق میں کامل مطابقت پائی جاتی ہے۔

۲۔ سائنس بتاتی ہے کہ ایک ستارے (مثلاً سورج) اور اس کے ذیلی سیارے (مثلاً زمین) کی تشکیل کے دونوں مرحلے باہم گتھے یا جڑے ہوتے ہیں۔ جنھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کی جن آیات کا ہم نے جائزہ لیا ہے ان سے بھی یہی حقیقت نکل کر سامنے آتی ہے۔

۳۔ قرآن میں ابتدائی مرحلے میں کائنات کے 'دھوئیں' کی صورت میں ہونے کا جو ذکر ہے اور جس سے مراد کائناتی مادے کا زیادہ تر گیس کی حالت میں ہونا ہے، یہ بھی جدید سائنس کے بنیادی سدیم کے تصور کے عین مطابق ہے۔

۴۔ سات کے عدد (اس کے معنی پر پہلے ہی بحث ہو چکی ہے) سے قرآن نے آسمانوں کی کثرت مراد لی ہے۔ فلکی طبیعیات کے ماہرین کے ان مشاہدوں سے

جدید سائنس نے اس کی تصدیق کر دی ہے جو انھوں نے کہکشانی نظاموں اور ان کی کثیر تعداد کے متعلق کیے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری زمین سے مشابہ زمینوں کا ایک سے زیادہ ہونا (کم سے کم بعض نقطہ ہائے نظر سے) ایک ایسا تصور ہے جو قرآن کے متن میں ابھر کر سامنے آتا ہے لیکن ابھی تک سائنس نے اس کی تصدیق نہیں کی۔ تاہم ماہرین اسے ممکن الوقوع خیال کرتے ہیں۔

۵۔ قرآن میں جو آسمانوں اور زمین کے مابین درمیانی تخلیق کا ذکر ہے، اس کا مقابلہ ان ہیولائی پلوں (bridgs of material) سے کیا جا سکتا ہے جو منظم ہیئتی طبیعیاتی نظاموں کے باہر موجود ہیں۔

اگرچہ قرآن کے بیانات سے پیدا ہونے والے تمام سوالات کی سائنسی معلومات سے پوری طرح تصدیق نہیں ہو سکی۔ تاہم کائنات کی تشکیل کے بارے میں قرآنی بیانات اور جدید سائنس میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ وحیٔ قرآنی کی تصدیق کے سلسلے میں اس امر واقعہ پر زور دینا ہی پڑتا ہے جب کہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ عہد نامۂ قدیم کا اول متن انہی موضوعات پر ایسی معلومات فراہم کرتا ہے جو سائنسی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں۔ یہ بات قابلِ تعجب نہیں کیونکہ بائبل کے مشائخی متن (Sacerdotal text) میں پیدائش کا بیان مذہبی پیشواؤں نے شریعت پرستانہ اغراض کے تحت جلاوطنی بابل کے وقت لکھا تھا۔ ان اغراض کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس لیے انھوں نے کائنات کی پیدائش کے بارے میں ایک ایسا بیان تیار کیا جو ان کے مذہبی عقائد کے مناسبِ حال تھا۔ چونکہ آغاز اسلام ہی سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف خواہ مخواہ کے ناحق الزامات لگائے جاتے رہے ہیں کہ انھوں نے بائبل کے بیانات نقل کر لیے ہیں، اس لیے بائبل کے بیانات اور قرآن کی فراہم کردہ معلومات میں جو عظیم فرق پایا جاتا

---

[1] یہودائی متن میں جو چند سطور موجود ہیں، یہ متن ان پر پوری طرح چھا گیا ہے اور وہ دب کر رہ گئی ہیں۔ یہ یہودائی متن اس قدر مختصر اور مبہم ہے کہ سائنسدان اسے قابلِ توجہ نہیں سمجھتے۔ (مصنف)

ہے، اس پر ایک دفعہ پھر زور دینا اور توجہ منعطف کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک کائنات کی پیدائش کا تعلق ہے، یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ایک شخص (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بائبل میں پائے جانے والے بیانات میں اس قدر ترمیم و تصحیح کر دے کہ سائنسی نقطۂ نظر سے غلط مواد کو خارج کر دے اور اپنی طرف سے ایسے بیانات دے جن کی تصدیق سائنس نے صرف موجودہ زمانے میں کی ہے؟ لہٰذا یہ مفروضہ سراسر غلط ہے۔ قرآن میں پیدائش (کائنات) کے متعلق جو بیان ملتا ہے، وہ بائبل کے بیان سے بالکل مختلف ہے۔

بعض اعتراضات کے جوابات

یہ مسلمہ امر ہے کہ دوسرے موضوعات خاص کر مذہبی تاریخ کے متعلق بائبل اور قرآن کے بیانات میں مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس لحاظ سے یہ بات بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ یسوعؑ کے خلاف اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ وہ بھی اس قسم کے حقائق اور بائبلی تعلیمات کو لیتے ہیں لیکن جب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی تعلیم و تبلیغ میں ان حقائق کا حوالہ دیتے ہیں تو اہلِ مغرب ان پر الزام لگانے سے باز نہیں آتے اور (نعوذ باللہ) انہیں فریب کار اور حیلیا گمان کرتے ہیں کیونکہ وہ (محمدؐ) ان حقائق کی وحی و تنزیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرآن میں وہی کچھ دہرایا ہے جو نے انہیں بتایا تھا، یہ ایسی ہی ہوایات ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ ایک عیسائی راہب نے انہیں خوب مذہبی تعلیم دی تھی، بہتر ہوگا کہ بلاشیری کی کتاب "محمدؐ کا مسئلہ" (The Problem of Mohammad)[1] ایک دفعہ پڑھ لی جائے تاکہ معلوم ہو کہ وہ اس 'موہوم قصے' کے متعلق کیا لکھتا ہے۔ قرآن کے

[1] فرانسیسی نام (Le Probleme de Mohamet) شائع کردہ پریس یونیورسیٹیز ڈی فرانس، پیرس، ۱۹۵۲ء)

دوسرے بیانات اور اعتقادات جو اپنے وقت اور اپنی قدامت کے لحاظ سے غالباً بائبل سے بھی کہیں آگے جاتے ہیں، ان کے بارے میں بھی مشابہت کے اشارے کنائے کیے جاتے ہیں۔

تخلیق کائنات سے متعلق بعض دیومالائی آثار و شواہد بھی کتب مقدسہ میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً اہلِ پالینشیا[1] میں یہ اعتقاد پایا جاتا ہے کہ ابتدا میں ایسے پانی (یا سمندر) موجود تھے جنہیں تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا اور جب روشنی ظاہر ہوئی تو وہ الگ الگ ہو گئے۔ اس طرح آسمان اور زمین تشکیل ہوئی۔ اس خلاقت کا مقابلہ بائبل کے بیان پیدائش سے کیا جاتا ہے۔ اور بے شک دونوں میں مشابہت ہے۔ لیکن اس بنا پر بائبل پر یہ الزام رکھنا محض ایک سطحی اور بات ہوگی کہ اس میں یہ بیان پالینشیا کے اس خیالی آفرینشی قصے سے نقل کیا گیا۔

بعینہٖ قرآن میں جو کائنات کے بنیادی مادی ہیولیٰ کے ابتدائی مرحلے پر ہی منقسم ہو جانے کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ اور جدید سائنس کا نظریہ بھی یہی ہے۔ اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس کا سرچشمہ کائنات کی آفرینش کے متعلق وہ متعدد اور مختلف دیومالائی کہانیاں ہیں جن میں قرآنی تصور سے کچھ مشابہت پائی جاتی ہے ایک سطحی بات ہوگی۔

مناسب ہوگا کہ ان دیومالائی اعتقادات و بیانات کا گہرا تجزیہ کیا جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان دیومالائی اعتقادات و بیانات میں سے کوئی بنیادی تصور ابھر کر سامنے آتا ہے جو فی نفسہٖ معقول معلوم ہوتا ہے اور ہمارے جدید علم و خبر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے لیکن دیومالائی قصے میں اس پر بے اصل اور عجیب و غریب بیانات کی تہیں چڑھی ہوتی ہیں۔ یہ ہے اصل اس خاصے عام تصور کی کہ آسمان اور زمین شروع میں

[1] پالینشیا بحرالکاہل میں منطقہ حارہ کے اندر یا اس کے نزدیک جزائر کے متعدد مجموعوں کا نام ہے۔ مترجم

باہم جڑے ہوئے تھے اور بعد میں الگ الگ ہو گئے۔ جب (جیسا کہ جاپان میں ہے)
اس کے ساتھ انڈے کی ایسی شبیہ جوڑ دی جائے جس سے ایک مادی صورت مترشح
ہو اور انڈے کے اندر تخم کی موجودگی کا تصور دے تو اس تحقیقی اضافے سے تصور میں
سنجیدگی کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ دوسرے ممالک میں ایک پودے کا تصور اس
کے ساتھ شریک کیا جاتا ہے۔ پودا نشوونما پاتا ہے اور سر اوپر اٹھاتا ہے۔ ایسا کرتے
وقت آسمانوں اور زمین کو الگ الگ کر دیتا ہے۔ یہاں بھی اضافہ کردہ تفصیل کا تخیلی انداز
اس خیالی قصے کو امتیازی خصوصیت عطا کرتا ہے۔ تاہم ایک مشترکہ خصوصیت باقی رہ
جاتی ہے۔ اور وہ ہے ارتقائی عمل کے آغاز میں واحد ہیولیٰ کا تصور جو کائنات کی تشکیل
پر منتج ہوا اور کائنات ہماری آج کی معلوم مختلف دنیاؤں میں منقسم ہو گئی۔

کائنات کی تخلیق کے بارے میں ان دیومالائی قصوں کو بیان کرنے کا مقصد یہ دکھانا
ہے کہ کیسے انسانی تخیل نے ان میں رنگ آمیزیاں کی ہیں اور اس موضوع پر ان میں اور
قرآن کے بیانات میں بنیادی فرق کیا ہے، قرآن کے بیانات دور از کار اور عجیب و غریب
تفصیلات سے مبرا ہیں اس کے برعکس قرآن کے بیانات کے الفاظ کی متانت اور سنجیدگی
اور سائنسی معلومات سے ان کی مطابقت انھیں دیومالائی بیانات سے ممتاز کرتی ہے۔

تخلیق کائنات کے بارے میں قرآن کے چودہ سو سال پرانے بیانات کسی انسانی
توضیح و تاویل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ (ان کی اصل انسانی نہیں الوہی ہے۔ مترجم)

قرآن اور فلکیات

قرآن افلاک کے بارے میں غور و فکر سے بھرا پڑا ہے۔ تخلیقِ کائنات سے متعلق
گزشتہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیسے آسمانوں اور زمینوں کی تعدد کے علاوہ ایسی مخلوق
کا بھی ذکر آیا ہے جنھیں قرآن آسمانوں اور زمین کی 'درمیانی مخلوق' کہتا ہے۔ جدید سائنس
نے آخر الذکر کی تصدیق کر دی ہے۔ تخلیق کائنات کے بارے میں جو آیات ہیں ان میں
پہلے ہی ایک عام تصور دیدیا گیا ہے کہ آسمانوں میں۔ یعنی زمین سے باہر۔ کیا کچھ
موجود ہے۔

جن آیات میں خصوصی طور پر تخلیقِ کائنات کا بیان ہے۔ ان کے علاوہ بھی قرآن
میں تقریباً چالیس آیات ایسی ہیں جن میں فلکیات کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں
گویا یہ تخلیق کے سلسلے کی آیات میں دی گئی معلومات کا تکملہ ہیں۔ ان میں سے بعض میں
صرف اس خالقِ کائنات کی عظمت و کبریائی کا بیان ہے جو ستاروں اور سیاروں کے
نظامات کا بانی اور منتظم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ستاروں اور سیاروں کے یہ سلسلے باہمی
نظم و توازن سے مرتب کیے گئے ہیں اور نیوٹن نے اجسام کی کشش باہمی کے اصول
سے ان کے استحکام و استقلال کی تشریح کی ہے۔

جن آیات کا یہاں پہلے حوالہ دیا جا رہا ہے وہ سائنسی تجزیے کے لیے زیادہ مواد
فراہم نہیں کرتیں۔ ان کا مقصد صرف خدا کی قدرت کاملہ کی طرف توجہ دلانا ہے لیکن ان
کا ذکر ضروری ہے تاکہ قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے نظام کائنات کو جس طرح

بیان کیا ہے اس کا ایک حقیقی تصور سامنے آجائے۔

یہ حوالے وحیٔ خداوندی کی ایک نئی حقیقت واقعہ پر مشتمل ہیں۔ نظامِ عالم کا بیان نہ تو اناجیل میں ہے اور نہ عہد نامۂ عتیق میں (سوائے چند تصورات کے، جن کی عمومی عدمِ صحت کا اندازہ ہمیں بائبل کے بیانِ پیدائش سے ہو چکا ہے)۔ لیکن قرآن میں اس موضوع پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ قرآن میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ اہمیت رکھتا ہے لیکن جو بیان نہیں کیا گیا، اس کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت سماوی دنیا کے متعلق جو نظریات متداول تھے، قرآن ان کا کوئی ذکر نہیں کرتا اور بعد میں سائنس نے ثابت کر دیا کہ وہ نظریات غلط تھے۔ اس کی ایک مثال آگے چل کر دی جائے گی تاہم اس منفی احتیاط و تامل کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

(۱) آسمانوں کے متعلق عام خیالات وافکار

سورۂ قٓ (۵۰) آیت ۶۔ موضوع عمومی انسان:۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝

ترجمہ:۔ کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔

سورۂ لقمان (۳۱) آیت ۱۰:

---

[۱] وہ لوگ جو قرآن کے اٹھائے ہوئے مسائل کی صرف انسانی توجیہ ڈھونڈتے ہیں اور کسی دوسری توجیہ کے قائل نہیں ہیں نے انھیں اکثر یہ کہتے سنا ہے "اگر قرآن میں فلکیات کے متعلق حیرت انگیز بیانات ملتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب اس علم میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔" لیکن یہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ عام طور پر مسلمان ممالک میں سائنس کا چرچا نزولِ قرآن کے بعد ہوا۔ اور اس عہد میں جو کچھ بھی سائنسی علم موجود تھا وہ کسی انسان کو اس قابل نہیں بنا سکتا تھا کہ فلکیات کے موضوع پر قرآن میں پائی جانے والی بعض آیات کو تصنیف و تحریر نہیں کر سکتا۔ اگلے پیراگرافوں میں اس کی وضاحت کی جائے گی۔ مصنف

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ۔

ترجمہ:۔ اس نے آسمانوں کو بیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں اور اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔

سورہ الرعد (۱۳) آیت ۲:۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۚ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ

ترجمہ:۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں پھر وہ اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقررہ تک کے لیے چل رہی ہے۔"

ان دونوں آیات سے اس اعتقاد کی تردید ہوتی ہے کہ گنبد آسمان ستونوں کے سہارے قائم ہے جو آسمانوں کو زمین پر گرنے اور اسے کچل دینے سے مانع ہیں۔

سورہ الرحمٰن (۵۵) آیت ۷

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝

ترجمہ: اس (اللہ) نے آسمان کو بلند کیا اور میزان قائم کر دی۔

سورۂ الحج (۲۲) آیت ۶۵:۔

وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ

ترجمہ: اور وہی (اللہ) آسمان کو تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا۔

یہ معلوم ہے کہ اجرام سماوی کے بُعد اور فاصلہ دراز کا ان کی کمیت مادہ کی ضخامت سے متناسب ہونا ان کے باہمی توازن کا باعث ہے۔[۱] یہ جتنے زیادہ ایک دوسرے سے دور ہوں

---

[۱] اقبال نے اپنے ایک شعر میں ملتِ اسلامیہ کو اتحادِ باہمی کی تلقین کرتے ہوئے تاروں کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ)

ہوں گے، ان کی باہمی کشش انجذاب اتنی ہی کمزور ہوگی۔ اور وہ جتنے ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہوں گے، ان کی باہمی کشش اتنی ہی زیادہ طاقتور ہوگی۔ یہ بات چاند کے بارے میں درست ہے جو (ہیئتی لحاظ سے) زمین کے قریب ہے اور قوانین کشش کی رو سے سمندر کے پانیوں کی پوزیشن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جوار بھاٹا کا باعث یہی ہے۔ اگر دو اجرام سماوی ایک دوسرے کے بہت قریب آجائیں تو ناگزیر طور پر آپس میں ٹکرا جائیں گے۔ یہ امر واقعہ کہ وہ ایک نظم اور قانون کے پابند ہیں، ان کے باہمی ٹکراؤ اور خلل وفساد سے بچے رہنے کی لازمی شرط ہے۔ آسمانوں کے قانونِ خداوندی کا پابند ہونے کا ذکر بھی اکثر قرآن میں آتا ہے۔ سورۃ المومنون (۲۳) کی چھیاسویں آیت میں خدا پیغمبرؐ سے خطاب کرتا ہے:

(اے نبی) ان سے پوچھو کہ "ساتویں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا [illegible]ن ہے؟"

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ 'سات آسمانوں' سے سات مراد نہیں بلکہ آسمانوں کی ایک غیر محدود تعداد مراد ہے۔

سورہ الجاثیہ (۴۵) آیت ۱۳:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ: اس (اللہ) نے زمین اور آسمان کی ساری چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرنے والے ہیں۔

سورۃ الرحمٰن (۵۵) آیت ۵:-

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝

ترجمہ: سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں۔

بقیہ حاشیہ:) باہمی جذب و توازن کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں (مترجم)

سورۃ الانعام (۶) آیت ۹۶:

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ

ترجمہ: وہی (اللہ) پردۂ شب کو چاک کر کے صبح نکالتا ہے۔ اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اسی نے چاند اور سورج کے طلوع وغروب کا حساب مقرر کیا ہے۔

سورہ ابراہیم (۱۴) آیت ۳۳

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَاۗىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝

ترجمہ: اس (اللہ) نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا۔

یہاں ایک آیت دوسری آیت کی تکمیل کرتی ہے۔ جن حسابوں، اندازوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، وہ زیرِ بحث اجرام سماوی کو ان کے راستے پر قائم رکھتے ہیں۔ اس کا اظہار لفظ 'دائبؔ' سے ہوتا ہے جو ایک ایسے فعل کا اسم ہے جس کے بنیادی معنی شوق و سرگرمی اور استقلال و محنت سے کام کرنے کے ہیں۔ یہاں اس کا مطلب 'مقررہ عادت کے مطابق لگاتار غیر متبدل طریقے سے احتیاط کے ساتھ کسی کام میں لگے رہنا ہے۔

سورہ یٰسین (۳۶) آیت ۳۹

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ښ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝

ترجمہ: ان کے لیے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔ اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ یہاں

۱؎ سورۂ ابراہیم کی مذکورہ بالا آیت ۳۳ میں اس کا صیغہ 'دائبین' استعمال ہوا ہے۔ مترجم

تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے۔

یہاں آخری راتوں کے گھٹتے چاند کو کھجور کی سوکھی چرمری ٹہنی سے تشبیہہ دی گئی ہے کیونکہ وہ بھی خمیدہ اور چرمر ہو کر ہلال کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مکمل تبصرہ بعد میں آئے گا۔

سورۃ النحل (۱۶) آیت ۱۲

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَٰتٌۢ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

ترجمہ: اس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب ستارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

جس عملی زاویۂ نگاہ سے اس کامل بے عیب نظم سماوی کو دیکھا گیا ہے، اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ انسان کے زمین پر اور سمندر میں سفر کرنے اور وقت کا حساب لگانے میں ممد و معاون ہے۔ یہ تبصرہ واضح ہو جاتا ہے اگر اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ بنیادی طور پر قرآن ایک دعوت و تبلیغ ہے جس کے ابتدائی مخاطب ایسے لوگ تھے جو صرف اپنی روزمرہ کی زندگیوں میں استعمال ہونے والی سادہ زبان سمجھتے تھے اس سے سورۃ الانعام (۶) کی حسب ذیل نویں آیت کے فکری عنصر کی توضیح ہو جاتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِى جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا۟ بِهَا فِى ظُلُمَٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندروں کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔

سورۃ النحل (۱۶) آیت ۱۶

وَعَلَٰمَٰتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ۝

ترجمہ: اس (اللہ) نے زمین میں راستہ بتانے والی علامات رکھ دیں اور ستاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں۔

سورۂ یونس (۱۰) آیت ۵:

هُوَ الَّذِى جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُۥ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا۟ عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ: وہی ہے جس نے سورج کو 'ضیا' اور چاند کو 'نور' بنایا۔ اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ایسی ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں کہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرتے ہو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بامقصد ہی بنایا ہے، وہ اپنی نشانیوں کو کھول کر پیش کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔

اس پر کچھ تبصرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بائبل میں سورج اور چاند دونوں کو 'روشنیاں'[1] (نیّر) کہا گیا ہے۔ البتہ سورج کا ذکر کرتے وقت 'نیّر' کے ساتھ 'اکبر' اور چاند کا ذکر کرتے وقت 'نیّر' کے ساتھ 'اصغر' کے اسمائے صفت اضافہ کر دیے گئے ہیں۔ یعنی سورج 'نیّر اکبر' ہے اور چاند 'نیّر اصغر'۔ لیکن قرآن کے نزدیک ان دونوں میں حجم و جسامت کی ہی مابہ الامتیاز نہیں بلکہ دوسرا فرق ہے۔ مان لیا کہ یہ صرف لفظی امتیاز۔ لیکن اس زمانے کے لوگوں کو ذہنی طور پر گڑبڑائے بغیر ان تک بات کیسے پہنچائی جا سکتی تھی اور ساتھ ہی ان پر یہ بھی واضح کر دیا جاتا کہ سورج اور چاند بعینہٖ ایک جیسی 'روشنیاں' یا نیّر نہیں ہیں؟

اجرامِ سماوی کی نوعیت

سورج اور چاند

سورج ایک روشن تجلی (ضیا) ہے اور چاند ایک روشنی (نور) ہے۔ جہاں

[1] انگریزی بائبل میں 'لیومینریز' (روشنیاں) کا لفظ آتا ہے جبکہ اردو بائبل میں 'نیّر' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (مترجم)

ان دونوں اصطلاحوں کی ترتیب الٹ جائے وہاں دوسروں کے مقابلے میں یہ ترجمہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ دراصل معنی میں فرق نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ 'ضیا' کا مادہ 'ضوء' ہے جس کے معنی کازیمرسکی (Kazimirski) کی مستند عربی فرانسیسی لغات کے مطابق 'درخشاں ہونا، چمکنا' ہیں (مثلاً آگ کی طرح)۔ یہی مصنف 'ضیا' کے معنی 'روشنی' بتاتا ہے۔

سورج اور چاند میں جو فرق ہے وہ قرآن کے مزید حوالوں سے واضح ہو جائے گا۔

سورۃ الفرقان (۲۵)، آیت ۶۱:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝

ترجمہ: بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔

سورۂ نوح (۷۱)، آیات ۱۵-۱۶

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝

ترجمہ: کیا دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح اللہ نے سات آسمان تہہ بر تہہ بنائے

---

[1] ضوء یا ضوء۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ ضوء کا لفظ نور سے زیادہ شدت اور قوت رکھتا ہے۔ نیز ضوء کسی کو ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس روشنی کو جو دوسرے سے اکتساب کی گئی ہو (تاج العروس)۔
قرآن کریم میں یکاد زیتہا یضیء یعنی "۲۴/۳۵ قریب ہے اس کا تیل کہ وہ روشن ہو جائے۔"
"اللہ نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو نورانی بنایا۔"
چونکہ یہاں ضیا اور نور کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے۔ لہٰذا مندرجہ ذیل معنی لیے جائیں گے۔ یعنی سورج کے لیے ذاتی روشنی اور چاند کے لیے اکتسابی روشنی (دوسرے سے حاصل کی ہوئی روشنی)

اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔

سورۃ النبا (۷۸)، آیات ۱۲-۱۳

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝

ترجمہ: ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان قائم کیے اور ایک نہایت روشن اور گرم چراغ پیدا کیا۔

یہ بالکل واضح ہے کہ نہایت روشن اور گرم چراغ (سراج وہاج)[1] سے مراد سورج ہے۔ یہاں چاند کی طرف ایک ایسے جرم فلکی کی حیثیت سے کی گئی ہے جو روشنی دیتا ہے یعنی 'منیر' ہے۔ 'منیر' اور 'نور' کا ایک ہی مادہ ہے۔ (چاند کی روشنی کو نور کہا گیا ہے) لیکن سورج کو ایک مشعل یا روشن چراغ (سراج وہاج) سے تشبیہ دی گئی ہے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے کا آدمی آسانی سے سورج اور چاند میں فرق کر سکتا تھا۔ صحراؤں کے رہنے والے درخشاں جرم سماوی سورج اور راتوں کو ٹھنڈی روشنی دینے والے چاند سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے قرآن میں ان دونوں کے متعلق جو موازنے اور مقابلے پائے جاتے ہیں وہ بالکل قدرتی ہیں۔ دلچسپ اور قابل لحاظ بات ان موازنوں، مقابلوں کی سنجیدگی اور متانت ہے اور متن قرآن میں ایسے کوئی تقابلی عناصر و اجزا نہیں پائے جاتے جو اس دور میں متداول تھے اور آج ہمارے دور میں خیالی و فرضی صورتوں کے مظاہر اور واہمے معلوم ہوں۔

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ سورج ایک ستارہ ہے جو اپنے اندرونی عمل احتراق سے شدید حرارت اور روشنی پیدا کرتا ہے لیکن چاند اپنی کوئی روشنی نہیں رکھتا اور ایک بے جان و جامد جرم فلکی ہے (کم سے کم اپنی بیرونی تہوں کی حد تک) جو سورج سے حاصل ہونے والی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ ان دونوں اجرام فلکی کے متعلق جو کچھ ہمیں معلوم ہے، قرآن کی کسی عبارت سے اس کی تردید نہیں ہوتی۔

---

[1] 'وہاج' کے معنی نہایت گرم اور نہایت روشن کے ہیں۔ مترجم

ستارے

جیساکہ ہم جانتے ہیں سورج کی طرح ستارے بھی اجرام فلکی ہیں۔ وہ مختلف قدرتی مظاہر کی تماشا گاہ ہیں اور ان مظاہر میں سے جو سب سے زیادہ آسانی سے ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں وہ ان کا روشنی پیدا کرنا ہے۔ وہ ایسے اجرام فلکی ہیں جو اپنی روشنی آپ پیدا کرتے ہیں۔

لفظ 'ستارہ' (نجم، جمع نجوم) قرآن میں تیرہ دفعہ آیا ہے۔ اس کا مادہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'ظاہر ہونا' 'نظر آنا'۔ لہذا لفظ ستارہ (نجم) سے ایک نظر آنے والا جرم فلکی مراد ہے لیکن اس کی نوعیت کا تعین نہیں کیا گیا آیا وہ خود روشنی پیدا کرتا ہے یا صرف دوسرے ذریعے سے حاصل ہونے والی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ یہ واضح کرنے کے لیے شے 'موسومہ ایک ستارہ ہے' ایک مجلہ توصیفی کا اضافہ کیا جاتا ہے جیساکہ حسبِ ذیل سورتوں میں۔

سورۂ الطارق (۸۶) آیات ۱-۳:

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ

ترجمہ: قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے.؟ چمکتا ہوا تارہ۔

قرآن میں شام کے ستارے کے ساتھ 'ثاقب' کا اسم صفت استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد ایسی چیز ہے جو کسی دوسری چیز (یہاں مراد رات کے تاریک سائے) کو چھید ڈالے۔ مزید براں یہی لفظ ٹوٹنے والے تاروں کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی شہابِ ثاقب (۳۷ : ۱۰)-

[1] سورت کے متن میں جو کچھ کہا جانے والا ہے، یہاں اس کی اہمیت پر شاہد کی حیثیت سے آسمان اور تارے کو استعمال کیا گیا ہے۔ مصنف

[2] راغب نے کہا ہے کہ 'طارق' راستے چلنے والے کو کہتے ہیں بالخصوص اس مسافر کو جو رات کو آئے، تارے کو بھی 'الطارق' کہتے ہیں کیونکہ وہ رات میں آتا ہے۔ (تاج العروس)۔ مترجم

سیّارے

یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا قرآن میں ان کا ذکر ٹھیک اس معنی میں آیا ہے جو اجرامِ فلکی کو آج کل دیئے جاتے ہیں۔

سیاروں کی اپنی روشنی نہیں ہوتی۔ وہ سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ اور زمین ان میں سے ایک ہے۔ اگرچہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے سیارے بھی فضائے آسمان میں موجود ہیں لیکن ہم صرف نظامِ شمسی کے سیاروں سے واقف ہیں۔ قدما کو زمین کے علاوہ پانچ دوسرے سیاروں کا علم تھا یعنی عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل۔ حالیہ زمانوں میں تین مزید دریافت کیے گئے ہیں یعنی یورنیس، نپ چون اور پلوٹو۔

قرآن میں انھیں 'کوکب' (جمع کواکب) کہا گیا ہے لیکن ان کی تعداد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ حضرت یوسفؑ کے خواب (سورۂ یوسف[1]) میں گیارہ کا ذکر ہے لیکن وہ ایک تخیّلی بیان ہے[1]۔

لفظ 'کوکب' کی ایک عمدہ تعریف قرآن کی ایک بہت مشہور سورت میں دی گئی ہے۔ اس کے گہرے معانی کی روحانی رمزیت ظاہر و باہر ہے اور ماہرین تفسیر کے لیے غور و بحث کا موضوع۔ تاہم اس میں لفظ 'کوکب' (جس سے مراد 'سیارہ' معلوم ہوتا ہے) کی جو تشبیہہ و مثال دی گئی ہے، اس کی کیفیت بیان کرنا بڑی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

[1] سورۂ یوسف (۱۲) میں گیارہ سیاروں کا ذکر سیارگانِ فلکی کی نسبت سے نہیں بلکہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی تعداد کے مطابق ہے۔ چاند اور سورج کا ذکر مزید ہے جن سے مراد ان کے والدین ہیں کہ گیارہ بھائی اور دونوں والدین ان کی عظمت کے آگے سر جھکائیں گے۔ سورہ میں یوسف اور ان کے گیارہ بھائیوں کا قصہ ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے قرآن میں اس سورہ کا نمبر بھی ۱۲ اور آیت ۴-۲۔ مترجم۔

سورۂ النور (۲۴) کی آیت ۳۵ کا متن حسب ذیل ہے۔
اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ۔

ترجمہ: اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (کائنات) میں اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو۔ چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارہ۔

یہاں موضوع بیان ایک جسم (شیشہ) پر روشنی ڈالنا ہے جو اسے منعکس کرتا ہے اور اسے موتی کی سی چمک دمک دیتا ہے ایک ایسے سیارے کی طرح جو سورج کی روشنی سے منور ہو، قرآن میں پائے جانے والے اس لفظ (کوکب) کے متعلق یہ واحد تفصیلی و تشریحی بیان ہے۔ یہ لفظ (کوکب) بعض دوسری آیات میں بھی آیا ہے۔ بعض آیات سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کوکب سے کون سے اجرامِ فلکی مراد ہیں ۶/۷۶ اور ۸۲/۱-۲۔
فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْہِ الَّیْلُ رَاٰ کَوْکَبًا جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۸۲/۱-۲ فضا میں پھیلی ہوئی توانیاں پھٹ جائیں گی اور ستارے منتشر ہو جائیں گے۔ ترجمہ)

تاہم اگر جدید سائنس کی روشنی میں دیکھا جائے تو سورۂ الصّٰفّٰت (۳۷) کی آیت ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ کواکب سے صرف وہ اجرام فلکی مراد ہیں جنھیں ہم سیارے کہتے ہیں:
اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ نِ الْکَوَاکِبِ ۵

(ہم نے آسمانِ دنیا) (یعنی سب سے نیچے آسمان) کو کواکب کی زینت سے آراستہ کیا ہے)۔

کیا یہ ممکن ہے کہ قرآنی الفاظ "السَّمَآءَ الدُّنْیَا" (سب سے نیچا آسمان) سے مراد 'نظام شمسی' ہو؟ یہ معلوم ہے کہ ہمارے قریب ترین اجرام فلکی میں سیاروں کے علاوہ اور کوئی مستقل عناصر نہیں پائے جاتے۔ نظام شمسی میں صرف سورج ہی ایک ستارہ (ثابت)

ہے۔ لہذا اگر 'کواکب' سے سیارے مراد نہ ہوں تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اور کون سے اجرام فلکی ہو سکتے ہیں؟ لہذا جو (انگریزی) ترجمہ محولہ بالا آیت کا دیا گیا ہے وہ درست معلوم ہوتا ہے اور قرآن کا اشارہ سیاروں کی موجودگی کی طرف ہے جیسا کہ جدید دور میں ان کی تعریف متعین کی گئی ہے:۔

"We have indeed adorned the lowest heaven with an ornament, the planets.[1]

سب سے نیچا آسمان (آسمانِ دنیا)

قرآن میں سب سے نیچے آسمان کا ذکر اجرامِ فلکی، جن سے وہ مرکب ہے، کے ساتھ بار بار آیا ہے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں، ان اجرام فلکی میں سیارے سرفہرست ہیں۔ لیکن جب قرآن خالص روحانی نوعیت کے بیانات کے ساتھ ایسے مادی تصورات کو متلازم کر دیتا ہے جنھیں ہم جدید سائنس کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں تو معنی میں ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح محولہ بالا آیت کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے سوائے اس کے کہ اس کے بعد آنے والی آیت ۷ (
اور ہر شیطان سرکش سے اسے محفوظ کر دیا ہے) میں ہر شیطان سرکش کے خلاف حفاظت

[1] مصنف نے یہ ترجمہ محمد مارماڈیوک پکھتال کے ترجمۂ قرآن (The Glorious Quran) سے لیا ہے۔ عبداللہ یوسف علی نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے۔
"We have indeed decked the lower heaven with beauty in the stars."
اپنے تشریحی نوٹ میں انھوں نے لکھا ہے کہ لفظ 'اسٹار' کو عمومی معنی میں لیا جائے، یعنی ستارہ، سیارہ، دم دار تارہ، شہاب ثاقب۔ جب کہ پکھتال نے تخصیص کر دی ہے۔ مترجم

کا ذکر ہے۔ سورہ الانبیاء (۲۱) آیت ۳۲[1]، سورہ حٰم السجدہ (۴۱) آیت ۱۲[2] میں پھر 'حفاظت' کا ذکر آتا ہے۔ یوں ہمیں بالکل مختلف نوعیت کے بیانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مزید براں سورہ مُلک کی آیت ۵ کی رو سے سب سے نچلے آسمان میں شیاطین کو مارنے کے لیے جو گولے 'میزائل پھینکے جاتے ہیں' ان سے کیا مراد ہے؟ جن 'اجرام فلکی' کا اس آیت میں ذکر ہے کیا مذکورہ بالا شہاب ثاقب سے ان کا کوئی تعلق ہے[3][4]؟

ان مشاہدات کا اس کتاب کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں ان کا ذکر موضوع کی تکمیل کی خاطر کیا گیا ہے۔ تاہم موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ یہ موضوع فہم انسانی کی حدوں سے آگے جاتا ہے اور سائنسی معلومات سے اس پر روشنی نہیں پڑتی۔

(ج) تنظیم سماوی

اس موضوع پر قرآن میں جو معلومات ملتی ہیں ان کا تعلق زیادہ تر نظامِ شمسی سے ہے۔ تاہم ایسے مظاہر کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں جو نظامِ شمسی سے پرے ہیں اور حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔

سورج اور چاند کے مداروں کے متعلق قرآن میں دو بہت اہم آیات ملتی ہیں:

---

[1] ۲۱:۳۲ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا۔ مترجم

[2] ۴۱:۱۲ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا۔ اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے آراستہ بنایا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ مترجم

[3] یہ معلوم ہے کہ جب کوئی شہابیہ فضا کی بالائی تہوں تک پہنچتا ہے تو یہ شہاب ثاقب کا سا روشن منظر پیدا کر سکتا ہے۔ مصنف

[4] سائنسی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فضا میں ہر وقت ہزاروں لاکھوں ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں اور شہابوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ یہی وہ گولے یا میزائل ہیں جو شیطانوں کو اوپر جانے سے روکتے ہیں۔ مترجم

سورۂ الانبیاء آیت ۳۳

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝

ترجمہ: اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک (مدار) میں تیر رہے ہیں۔

سورہ یٰسٓ، آیت ۴۰ (پہلے گذر چکی ہے):

"نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے سب ایک ایک فلک (مدار) میں تیر رہے ہیں۔

یہاں ایک ضروری حقیقت وضاحت سے بیان کر دی گئی ہے، یعنی سورج اور چاند کے مداروں کا موجود ہونا اور ان اجرام فلکی کا خود اپنی حرکت سے خلا میں سفر کرنا۔

ان آیات کے مطالعے سے ایک منفی حقیقت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ یہ تو معلوم ہو گیا کہ سورج ایک مدار پر حرکت کرتا ہے لیکن اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ اس مدار کا زمین سے کیا تعلق ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج حرکت کرتا ہے اور زمین ساکن ہے۔ بطلیموس (دوسری صدی قبل مسیح) کے زمانے سے یہ نظریہ متداول چلا آتا تھا کہ مرکزِ کائنات زمین ہے اور کوپرنیکس (سولھویں صدی عیسوی) کے زمانے تک یہی نظریہ رائج رہا۔ اگرچہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے لوگ بھی اسی نظریئے کے مؤید تھے لیکن قرآن میں اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

چاند اور سورج کے مدار

یہاں عربی لفظ 'فلک' کا ترجمہ مدار (orbit) کیا گیا ہے۔ قرآن کے بہت سے فرانسیسی مترجمین نے اس کا ترجمہ کرہ (sphere) کیا ہے۔ درحقیقت اس کے بنیادی معنی یہی ہیں لیکن ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کا ترجمہ 'مدار' (orbit) کیا ہے'

اس لفظ سے نسبتاً پرانے مترجمین قرآن کو تشویش پیدا ہوئی جو چاند اور سورج کی دائرہ نما حرکت کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ خلا میں ان کے راستے کے متعلق اپنے قائم کردہ تصورات پر جمے رہے جو یا تو کم و بیش حد تک درست تھے یا سراسر غلط۔ اپنے ترجمۂ قرآن میں حمزہ بوبکر اس لفظ کے بہت سے ترجموں اور مفہوموں کا ذکر کرتا ہے: "ایک قسم کا دھرا، لوہے کا ڈنڈا جس پر چکی گھومتی ہے، کرۂ آسمانی، مدار، برج، رفتار، لہر. . . ." لیکن اس پر دسویں صدی عیسوی کے مشہور مفسر طبری کے حسبِ ذیل تبصرے کا اضافہ کر دیا ہے:

"اگر ہمیں کسی چیز کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو تو خاموش رہنا واجب ہے۔" (۱۷:۱۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ چاند اور سورج کے مدار کے تصور کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ لفظ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے عام ہیئتی تصور کا ترجمان ہوتا تو ان آیات کی تشریح و ترجمانی اس قدر مشکل نہ ہوتی۔ لہٰذا قرآن نے جو تصور پیش کیا وہ بالکل نیا تھا جس کی تشریح و توضیح کئی صدی بعد ہونے کی تھی۔

۱- چاند کا مدار

آج کل یہ تصور عام ہو گیا ہے کہ چاند زمین کا ذیلی سیارہ ہے اور انتیس دن میں اس کے گرد ایک چکر پورا کرتا ہے لیکن اس کے بالکل دائرہ نما مدار کے متعلق ایک تصحیح ضروری ہے کیونکہ جدید فلکیات کے مطابق اس کے مدار میں قدرے بے مرکزیت یا سنک سی ہے، اس طرح زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ (۲ لاکھ ۴۰ ہزار میل) صرف اوسط فاصلہ ہے (سو فیصد درست اور متعین نہیں)۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کیسے وقت کا حساب لگانے کے لیے قرآن چاند کی حرکات کے مشاہدے کی افادیت پر زور دیتا ہے۔ (دیکھیے سورہ ۱۰، آیت ۵ جس کا حوالہ اس باب کے شروع میں دیا جا چکا ہے)

چاند کی گردش پر مبنی نظامِ اوقات پر اکثر یہ نکتہ چینی کی گئی ہے کہ یہ ہمارے نظام

اوقات، جو سورج کے گرد زمین کی گردش پر مبنی ہے (اور آج جولین کیلنڈر کی صورت میں موجود ہے)، کے مقابلے میں فرسودہ، ناقابلِ عمل اور غیر سائنسی ہے۔

اس نکتہ چینی کے سلسلے میں حسبِ ذیل ریمارکس ضروری معلوم ہوتے ہیں:-

(ا) آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے قرآن کے اولین مخاطب جزیرہ نمائے عرب کے باشندے تھے جو قمری حساب وقت کے عادی تھے۔ قرینِ مصلحت یہی تھا کہ ان سے انہی کی زبان میں خطاب کیا جائے جو وہ سمجھتے تھے اور ان کی فضائی اور زمینی علامات حوالہ متعین کرنے کی عادتوں کو جوں کا توں چھوڑ دیا جائے کیونکہ ان کی خاصی افادیت تھی۔ سبھی جانتے ہیں کہ ریگستانوں کے رہنے والے آسمان کے مشاہدے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ ستاروں کے مطابق جہاز رانی کرتے تھے، اور چاند کے تغیر و ارتقا کی منازل کی رُو سے وقت کا حساب لگاتے تھے۔ یہ تھے وہ سادہ ترین اور معتبر ترین ذرائع جو خشکی اور سمندر کے سفروں میں رہنمائی حاصل کرنے اور وقت کا حساب لگانے کے لیے انہیں میسر تھے۔

(ب) ماہرین کو چھوڑ کر لوگوں کی اکثریت کو یہ معلوم نہیں کہ جولین کیلنڈر اور قمری کیلنڈر کے درمیان کامل نزوم باہمی پایا جاتا ہے چنانچہ ۲۳۵ قمری مہینے جولین کیلنڈر کے ۳۶۵¼ دن کے سال کے حساب سے ٹھیک ۱۹ سال کے برابر ہوتے ہیں۔ اور پھر ہمارے ۳۶۵ دن والے سال کی طوالت نقص سے خالی نہیں کیونکہ ہر چوتھے سال کو لوند کا سال (leap year) قرار دے کر اس کی تصحیح کرنا پڑتی ہے۔ جولین کیلنڈر کے ہر ۱۹ سال بعد یہی معاملہ قمری کیلنڈر کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔ یونانی ماہر فلکیات میٹون (Meton) کے نام پر اسے میٹونی دور (Metonic cycle) کہتے ہیں کیونکہ پانچویں صدی قبل مسیح میں شمسی اور قمری تقویموں کے مابین پائے جانے والے اس قطعی لزوم کو اسی نے دریافت کیا تھا۔

۲- سورج

چونکہ ہم اپنے نظامِ شمسی کو سورج کے گرد منظم حالت میں دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں، اس لیے سورج کے مدار کا تصور کرنا ہمارے لیے نسبتاً زیادہ مشکل ہے۔ قرآن کی

آیت کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری کہکشاں میں سورج کی پوزیشن پر غور کیا جائے' اس لیے جدید سائنسی نظریات و تصورات کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

ہماری کہکشاں میں ستاروں کی بہت بڑی تعداد شامل ہے اور وہ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ ان سے ایک قرص سا بن گیا ہے۔ جو کناروں کے مقابلے میں مرکز پر زیادہ گنجان ہے۔ اس میں سورج کی پوزیشن قرص کے مرکز سے بہت ہٹی ہوئی ہے۔ کہکشاں اپنے محور پر گھومتی ہے جو اس کا مرکز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سورج بھی ایک گول مدار پہ اسی مرکز کے گرد گھومتا ہے۔ جدید علم فلکیات کے ماہرین نے اس کی تفاصیل معلوم کرلی ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں شیپلے (Shapley) نے حساب لگایا کہ سورج اور ہماری کہکشاں کے مرکز کے درمیان ۱ کیلو پارسیکس (Kiloparsecs) کا فاصلہ ہے یعنی

۲ .... میل

اپنے محور پر ایک گردش مکمل کرنے کے لیے کہکشاں اور سورج کو تقریباً ۲۵ کروڑ سال لگتے ہیں۔ اس گردش کی تکمیل کے سلسلے میں سورج تقریباً ۱۵۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتا ہے۔

یہ ہے سورج کی وہ مداری گردش جس کا ذکر قرآن نے چودہ سو سال پہلے کیا۔ جدید فلکیات کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس کے وجود اور تفاصیل کا مشاہدے سے اثبات کیا۔

سورج اور چاند کے اپنی حرکت سے فضائے بسیط میں گردش کرنے کا ذکر

ادیبوں نے قرآن کے جو ترجمے کیے ہیں ان میں یہ تصور نہیں ملتا کیونکہ ان حضرات کو فلکیات کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ انھوں نے متعلقہ عربی لفظ (یسبحون)، جو نقل و حرکت کو ظاہر کرتا ہے، کا ترجمہ اس کے متعدد معنی میں سے ایک کو مدنظر رکھ کر کیا ہے جس کا مطلب ہے 'تیرنا'۔ انھوں نے فرانسیسی ترجموں میں بھی ایسا ہی کیا ہے اور عبداللہ یوسف

علی نے اپنے قابل قدر انگریزی ترجمے میں بھی ایسا ہی کیا ہے۔

خود کار حرکت سے نقل و گردش کے اظہار کے لیے دونوں آیتوں میں سَبَحَ (یسبحون)[1] کا فعل استعمال ہوا ہے۔ اس فعل کے تمام مطالب و معانی ایسی نقل و گردش پر دلالت کرتے ہیں جس کا تعلق متعلقہ جسم سے پیدا ہونے والی حرکت سے ہو۔ اگر یہ نقل و گردش پانی میں واقع ہو تو اسے 'تیرنا' کہتے ہیں۔ اگر زمین پر واقع ہو تو اسے اپنی ٹانگوں کے ذریعے نقل و گردش کرنا کہیں گے۔ لیکن جو نقل و گردش فضائے بسیط میں واقع ہو تو اس کے لیے مذکورہ لفظ کے بنیادی معنی استعمال کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ترجمے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی:

چاند اپنے محور کے گرد گردش بھی اتنے ہی دنوں میں مکمل کرلیتا ہے جتنے دنوں میں کہ زمین کے گرد مکمل کرتا ہے یعنی تقریباً ۲۹½ دن۔ اس طرح اس کی ہمیشہ ایک ہی سطح ہمارے سامنے رہتی ہے۔

سورج کو اپنے محور کے گرد گردش کرنے میں تقریباً ۲۵ دن لگتے ہیں۔ خطِ استوا اور قطبین پر اس پر گردش میں کچھ اختلافات ہیں۔ (یہاں ہم ان کی تفصیل میں نہیں جائیں گے) لیکن مجموعی حیثیت سے محوری حرکت و گردش ہی سے سورج کی فعالیت اور گرماگرمی ہے۔

لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ایک فعل[1] کے باریک معنوی بین فرق کا اشارہ سورج اور چاند کی اپنی حرکت کی طرف ہے۔ ان دونوں اجرامِ فلکی کی حرکات تصدیق جدید سائنسی معلومات سے ہوگئی ہے اور یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک شخص خواہ وہ اپنے زمانے میں کیسا ہی صاحبِ علم و خبر رہا ہو (اور محمدؐ[2] کے بارے میں تو یہ بات یقیناً صحیح نہیں) ایسے امور کو اپنے احاطۂ ذہن و خیال میں لاسکتا۔

---

[1] سَبَحَ ، یُسَبِّحُوْنَ مترجم

[2] آنحضرتؐ اُمّی تھے۔ مترجم

بعض دفعہ اس نقطۂ نظر کو مخالفانہ بحث کا موضوع بنایا جاتا ہے اور قدیم زمانے کے عظیم مفکرین کی مثالیں دی جاتی ہیں جنھوں نے بے شک وشبہ بعض ایسے علمی و سائنسی حقائق کی پیشن گوئیاں کیں جن کی جدید سائنس نے تصدیق کر دی ہے۔ لیکن اس کے لیے انھوں نے شائد ہی سائنسی تعلیم پر تکیہ کیا ہو۔ ان کا طریق کار زیادہ تر فلسفیانہ استدلال کا تھا۔ اس طرح اکثر فیثا غورث کے پیروؤں کا معاملہ بطور حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔ انھوں نے چھٹی صدی قبل مسیح میں زمین کی گردش محوری اور سورج کے گرد سیاروں کی گردش کے نظریے کا دفاع کیا تھا۔ جدید سائنس نے اس نظریے کی تصدیق کر دی ہے۔ فیثا غورث کے پیروؤں کی مثال کو سامنے رکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک ایسا ذہین وطباع مفکر فرض کرنا آسان ہو جاتا ہے جس نے اپنی قوت متخیلہ سے کام لے کر وہ سب کچھ معلوم یا فرض کر لیا جس کا انکشاف سائنس نے کئی صدی بعد کیا۔ لیکن ایسا کرتے وقت نکتہ چین حضرات یہ بتانا بھول جاتے ہیں کہ فلسفیانہ استدلال کے ان عبقریوں (geniuses) نے اپنے فکر ونظر میں کیسی کیسی ہمالائی غلطیاں کی ہیں جن سے ان کی کتابیں بھری پڑی ہیں مثلاً یہ بات یاد رہے کہ فیثا غورث کے پیروؤں نے اس نظریے کا بھی دفاع کیا جس کی رو سے سورج فضائے بسیط میں ایک ستارہ ثابت کی طرح اپنی جگہ پر قائم ہے (اور حرکت و گردش سے اسے کوئی سروکار نہیں)۔ انھوں نے سورج کو دنیا کا مرکز قرار دیا اور ایک ایسے نظام فلکی کا تصور پیش کیا جس کا مرکز سورج تھا۔ قدیم زمانے کے عظیم فلسفیوں کی تصانیف میں کائنات کے متعلق اکثر صحیح اور غلط تصورات کا ملغوبہ ملتا ہے۔ ان انسانی تصانیف کی عظمت و درخشانی کا انحصار ان میں پائے جانے والے ترقی یافتہ خیالات و تصورات پر ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ جو غلط تصورات ونظریات ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں، انھیں نظر انداز کر دیا جائے۔ خالص سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان کے یہی غلط تصورات انھیں قرآن سے متمیز کرتے ہیں۔ موخرالذکر میں بہت سے ایسے موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا جدید علم سے تعلق ہے لیکن ان میں ایک بھی ایسا بیان نہیں ملتا جو جدید سائنس کے مصدقات کے منافی و مخالف ہو۔

رات اور دن کا تسلسل

ایک ایسے زمانے میں جب کہ زمین کو دنیا کا مرکز تصور کیا جاتا تھا اور یہ کہ سورج اسی کی نسبت سے حرکت کرتا تھا، یہ کیسے ممکن تھا کہ دن اور رات کے تسلسل اور یکے بعد دیگرے آنے کی بات چھیڑی جائے اور سورج کی حرکت کا ذکر نہ آئے؟ لیکن قرآن میں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا اور اس موضوع یعنی سلسلہ روز وشب کے متعلق قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

سورۂ الاعراف (۷) آیت ۵۴

يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا

ترجمہ: (اللہ) رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔

سورہ یٰسٓ، آیت ۳۷

وَآيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُم مُّظْلِمُونَ ۝

ترجمہ: ان کے لیے ایک اور نشانی رات ہے۔ ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

سورۂ لقمان (۳۱) آیت ۲۹

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۔

ترجمہ: کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔

اول الذکر آیت پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ دوسری آیت سورۃ الزمر (۳۹) آیت ۵:

يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ ۔

ترجمہ: وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔

یہ محض ایک استعارہ (image) ہے۔

تیسری اور چوتھی محولہ بالا آیات دن اور رات کے باہمی نفوذ یعنی ایک دوسرے میں

گھس جانے' خاص کر رات کے دن پر پٹ جانے اور دن کے رات پر پٹ جانے کے عمل کے متعلق دلچسپ مواد فراہم کرتی ہیں (۳۹ : ۵)

عربی زبان کے فعل 'کَوَّرَا' کا بہترین ترجمہ آر بلاشیری نے اپنے فرانسیسی ترجمۂ قرآن میں دیا ہے[1] جو اردو زبان کے فعل 'لپیٹنا' کا مترادف ہے۔ اس لفظ کے اصلی اور بنیادی معنی سر پر پگڑی لپیٹنا ہیں۔ اس لفظ کے تمام دوسرے مطالب میں بھی 'لپیٹنا' کا تصور برقرار ہے۔

لیکن درحقیقت فضائے بسیط میں کیا وقوع میں آتا ہے؟ جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے امریکی خلابازوں نے اپنے خلا کے جہاز سے اس کا مشاہدہ کیا ہے اور اس کے فوٹو سے ہمیں خاص کر زمین سے بہت بڑے فاصلے پر سے' یعنی چاند پر سے۔ انھوں نے دیکھا کہ کیسے سورج زمین کی سطح کے نصف حصے کو جو اس کے بالمقابل ہوتا ہے مستقلاً روشن کرتا ہے (سوائے اس کے کہ جب گرہن ہو)۔ جب کہ روئے زمین کا آدھا حصہ تاریکی میں ہوتا ہے۔ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور روشنی اسی طرح رہتی ہے۔ اس طرح نصف کرے کی شکل میں کچھ رقبہ زمین کے گرد ۲۴ گھنٹے میں ایک چکر پورا کرتا ہے جب کہ دوسرا نصف کرہ' جو اس دوران میں تاریکی میں رہا ہوتا ہے اتنے ہی وقت میں ویسا ہی چکر پورا کرتا ہے۔ رات اور دن کے اس دائمی چکر کو قرآن میں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ آج کل فہم انسانی کے لیے اس تصور کو اپنی گرفت میں لینا آسان ہوگیا ہے کیونکہ ہم سورج کی مقابلتاً بے حرکتی اور زمین کی گردش سے واقف ہیں۔ یہ دائمی (Process of coiling) کا عمل جس میں ایک سیکٹر کا دوسرے میں گھس جانا بھی شامل ہے' قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے زمین کے گول ہونے کا نظریہ پہلے ہی وضع اور مسلم ہو چکا ہو حالانکہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔

---

[1] چونکہ مصنف فرانسیسی میں اس لیے فرانسیسی تراجم کا حوالہ دیتے ہیں۔ انگریزی ترجمہ 'To coil' یا 'To wind' ہے۔ ہم نے متداول اردو ترجمہ دے دیا ہے۔ مترجم

دن اور رات کے ایک دوسرے کے بعد آنے کے متعلق مندرجہ بالا افکار و خیالات کے علاوہ قرآنی آیات کے حوالے سے یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ مشرق اور مغرب بھی ایک سے زیادہ ہیں۔ ان مظاہر کا انحصار عمومی مشاہدات پر ہے۔ یہاں اس کا ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر قرآن جو کچھ کہتا ہے اسے من و عن نقل کر دیا جائے۔

مثالیں حسب ذیل ہیں:

سورۂ المعارج (۷۰) کی آیت ۴۰ میں 'ربّ المشارق والمغارب' کے الفاظ آئے ہیں جن کا مطلب ہے مشرقوں اور مغربوں کا مالک۔

سورۂ الرحمٰن (۵۵) کی آیت ۱۷ ہے 'ربُّ المشرقین وربُّ المغربین' یعنی دونوں مشرق اور دونوں مغرب کا مالک و پروردگار وہی ہے۔

سورۂ الزخرف (۴۳) کی آیت ۳۸ میں 'بُعدَ المشرقین' کے الفاظ ملتے ہیں یعنی دو مشرقوں کا درمیانی فاصلہ۔ یہ ایک استعارہ ہے اور مطلب ہے دو نقاط کے درمیان کا بے حد طویل فاصلہ۔

سورج کے طلوع و غروب کا بغور مشاہدہ کرنے والا جانتا ہے کہ موسم کے لحاظ سے سورج مشرق کے مختلف مقامات سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب کے مختلف مقامات پر غروب ہوتا ہے[1]۔ ہر افق کی سمتوں کی پیمائش نہ کرنے سے دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کی انتہائی حدوں کا تعین کیا جا سکتا ہے اور ان انتہائی حدوں کے درمیان سال بھر کے نقاط طلوع و غروب آجاتے ہیں۔ یہ بیان کردہ مظہر عام اور پیش پا افتادہ ہے۔ لیکن اس باب میں جو دوسرے مضامین اور موضوعات زیر بحث آئے ہیں وہ اصل توجہ کے مستحق ہیں کیونکہ وہاں قرآن کے بیان کردہ جن فلکیاتی مظاہر کا حوالہ دیا گیا ہے وہ جدید سائنسی معلومات و انکشافات کے عین مطابق ہیں۔

---

[1] گرمی اور سردی کے موسموں میں یہ مشاہدہ عام ہے۔ مترجم

د- آسمانوں کا ارتقاء

کائنات کی تشکیل کے بارے میں جدید سائنسی نظریات کو قارئین کے سامنے لانے کے بعد ہم نے اس ارتقا کا ذکر کیا تھا جو بنیادی سدیم (Nebula) سے شروع ہوا اور کہکشاؤں، ستاروں اور (نظام شمسی کے لیے) سورج اور سیاروں کے ظہور پر منتج ہوا۔ جدید سائنسی معلومات ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ نظام شمسی میں اور اس سے بھی زیادہ عمومی طور پر خود کائنات میں ارتقا کا عمل اب بھی جاری ہے۔

جو شخص ان خیالات و نظریات سے آگاہ ہے وہ قرآن کے بعض بیانات جن میں خدا کی قدرتِ کاملہ کے ظہورات کا ذکر ہے، کا مقابلہ ان نظریات سے کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قرآن ہمیں بار بار یاد دلاتا ہے کہ "خدا نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ سب ایک وقت مقرر تک چلے جا رہے ہیں۔"

یہ فقرہ سورہ الرعد (۱۳) کی آیت ۲، سورہ لقمان (۳۱) کی آیت ۲۹، سورہ فاطر (۳۵) کی آیت ۱۳ اور سورہ الزمر (۳۹) کی آیت ۵ میں پایا جاتا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى۔

اس کے علاوہ سورہ یٰسٓ (۳۶) کی آیت ۳۸ میں منزلِ مقصود (Destination-place) کے تصور کے ساتھ ایک مقررہ مقام یا ٹھکانے (Settled place) کا خیال بھی وابستہ پایا جاتا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ٥

ترجمہ: اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست عظیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔

ٹھکانہ (Settled place) قرآنی لفظ 'مستقر' کا ترجمہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں ایک ٹھیک اور قطعی مقام کا تصور پایا جاتا ہے۔

ان قرآنی بیانات کا جدید سائنس کی مسلمہ معلومات سے مقابلہ کرنے سے کیا صورت حال سامنے آتی ہے۔

قرآن کی رو سے سورج کے ارتقا کا ایک مقصد اور اختتام ہے اور اس کے لیے ایک منزلِ مقصود (destination place) ہے۔ اس کی رو سے چاند کے لیے بھی ایک 'مستقر' یا ٹھکانا ہے۔ ان بیانات کے ممکنہ مطالب کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جدید سائنسی علم ستاروں کے ارتقا کے متعلق بالعموم اور سورج کے ارتقا کے متعلق بالخصوص کیا کہتا ہے اور جو اجرامِ سماوی خود بخود فضائے بسیط میں سورج کی حرکت کا اتباع کرتے ہیں جن میں چاند بھی شامل ہے۔ ان کے ارتقا کے متعلق سائنس کیا کہتی ہے:

فلکی طبیعات کے ماہرین کی رائے میں سورج کی عمر تقریباً ۴ء۵ کھرب سال ہے تمام دوسرے ستاروں کی طرح اس کے انتہائے ارتقا کے ایک مرحلے کو شناخت اور دوسروں سے اس کی تمیز کرنا ممکن ہے۔ اس وقت سورج ایک ابتدائی مرحلے میں ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہائڈروجنی ایٹم تغیر طبیعی سے ہیلیم (Helium) ایٹموں میں بدل جاتے ہیں۔ اصولاً سورج کا یہ مرحلہ مزید پچپن کھرب سال جاری رہنا چاہیے کیونکہ جو حسابات لگائے گئے ہیں ان کی رو سے اس قسم کے ستارے کا ابتدائی مرحلہ سو کھرب سال کا ہوتا ہے۔ دوسرے ستاروں کے سلسلے میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ اس مرحلے کے بعد ایک دوسرا دور آئے گا جس میں ہائڈروجن تغیر طبیعی سے ہیلیم میں بدل جائے گی۔ اس کا نتیجہ ہوگا کہ اس کی بیرونی تہوں میں پھیلاؤ پیدا ہوگا اور سورج سرد ہونے لگے گا۔ آخری مرحلے پر اس کی روشنی بہت کم ہو جائے گی اور کثافت (Density) بہت بڑھ جائے گی۔ اس عمل کا مشاہدہ 'سفید بونے'

(White dwarf) قسم کے تاروں میں ہوتا ہے۔

محولہ بالا مرحلوں کی تکمیل میں جتنا وقت لگے گا' یہ اس کا ایک کام چلاؤ اندازہ ہے[1] لیکن مذکورہ باتوں میں سے یاد رکھنے کا خاص نکتہ ارتقا کا تصور ہے۔ جدید معلومات کی روشنی میں ہم یہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ چند بلیون سالوں میں نظامِ شمسی کے موجودہ حالات بدل جائیں گے۔ دوسرے تاروں کی طرح' جن کے تغیرات طبیعی آخری مرحلے تک ریکارڈ کیے جا چکے ہیں' سورج کے خاتمے کی پیشین گوئی کرنا ممکن ہے۔

سورۂ یٰسین (۳۶) کی آیت ۳۸ کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے' اس میں سورج کے اپنی منزل اور مستقر کی طرف رواں دواں ہونے کا ذکر ہے۔

جدید علم ہیئت نے اس منزل و مستقر کا تعین کر دیا ہے اور اسے راس الشمس (Solar Apex) کا نام دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فضائے بسیط میں نظامِ شمسی کا ارتقا ایک ایسے نقطے کی طرف ہو رہا ہے جو ہرکولیس تارا منڈل (Constellation- of Hercules) میں واقع ہے اور اس کا صحیح محلِ وقوع باوثوق طریقے سے متعین کیا جا چکا ہے۔ یہ تقریباً ۱۲ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔

قرآن کی محولہ بالا دو آیات کے سلسلے میں یہ تمام فلکیاتی اعداد و شمار بیان کیے جانے کے مستحق ہیں کیونکہ وہ (آیات) جدید سائنسی معلومات سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔

کائنات توسیع

جدید سائنس کا سب سے زیادہ مرعوب کن انکشاف یہ ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ اب یہ ایک مسلمہ تصور ہے اور بحث طلب امر صرف یہ ہے کہ کائنات کی توسیع

---

[1] ایک بلیون (Billion) = دس کھرب۔ مترجم

[2] بقول شاعر   یوں نہیں گردش میں رہنے کے ہمیشہ مہر و ماہ
ختم اک دن دورۂ شمس و قمر ہو جائے گا

کیسے واقع ہو رہی ہے؟ سب سے پہلے اس کا خیال اضافیت کے نظریۂ عام سے پیدا اور کہکشانی طیف (Galactic Spectrum) کی جانچ پڑتال کے سلسلے میں طبیعیات سے اس کی تائید ہوئی۔ کہکشائیں جو اپنے طیف (Spectrum) کے سُرخ سیکشن کی طرف باقاعدہ حرکت کرتی ہیں' اس کی توجیہہ ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں کے بُعد سے کی جا سکتی ہے۔ یوں کائنات کا سائز شاید لگاتار بڑھتا جا رہا ہے کہکشائیں ہم سے جتنی زیادہ دور ہوں گی' کائنات کے سائز میں یہ اضافہ اتنا ہی بڑا ہوگا اس مسلسل پھیلاؤ کے دوران میں جن رفتاروں سے یہ اجرامِ فلکی دور ہوتے جا رہے ہیں' وہ روشنی کی رفتار کی ایک کسر اعشاریہ سے لے کر اس سے تیز تر بھی ہو سکتی ہیں۔[1]

قرآن کی مندرجہ ذیل آیت (۵۱ : ۴۷) جس میں خدا کی طرف سے خطاب ہے کا مقابلہ شاید جدید تصورات سے کیا جا سکتا ہے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ○ (الذّٰریٰت : ۴۷)

The heaven, we have built it with power. verily, we are expanding.

ترجمہ: آسمان کو ہم نے اپنی قدرت سے بنایا ہے۔ بے شک ہم اس میں توسیع کیے جا رہے ہیں۔[2]

آسمان (Heaven) عربی لفظ 'سماء' کا ترجمہ ہے اور یہاں اس سے ماسوٰی ارضی دنیا مراد ہے۔

"ہم اس میں توسیع کر رہے ہیں" 'فعل اَوْسَعَ' کے اسم حالیہ (جمع) مُوْسِعُوْنَ

---

[1] یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید   کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون   اقبال
قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمایا گیا ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے کائنات میں اضافہ کرتا ہے۔ مترجم

[2] اس آیت کا مصنف اور اس کے رفیقِ کار انگریزی مترجم نے جو انگریزی ترجمہ دیا ہے' یہ اس کا اردو ترجمہ ہے جو ہم نے کیا ہے۔ مترجم

کا ترجمہ ہے۔ 'اَوْسَعَ' کا مطلب ہے 'وسیع تر کرنا' 'زیادہ فراخ کرنا' 'بڑھانا' 'پھیلانا'۔ بعض مترجمین جو لفظ 'مُوْسِعُوْنَ' کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکے' انھوں نے ایسے ترجمے کئے ہیں جو میری نظر میں درست نہیں۔ مثلاً آر۔ بلاشیری نے اس کا جو فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے اس کا مطلب انگریزی میں 'We give generously' ہوتا ہے۔ یعنی 'ہم فراخدلی سے عطا کرتے ہیں۔" دوسروں نے اس کا مطلب سمجھا تو ہے لیکن اپنے آپ کو مصنوعی لحاظ سے پابند کرنے سے خائف ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے فرانسیسی ترجمۂ قرآن میں آسمانوں اور فضائے بسیط کو چوڑا اور فراخ کرنے کا ذکر کیا ہے لیکن ساتھ ہی سوالیہ نشان بھی لگا دیا ہے اور پھر وہ لوگ ہیں جو اپنی تقاریر میں مستند سائنسی خیالات و تصورات کا حوالہ دیتے ہیں اور وہی مطلب بیان کرتے ہیں جو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ قاہرہ کی امورِ اسلامی کی مجلسِ اعلیٰ (Supreme council for Islamic Affairs) کی مدون کردہ کتاب تفاسیر 'منتخب' کا یہی حال ہے۔ اس میں کائنات کے پھیلاؤ کا ذکر بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کیا گیا ہے۔[1]

---

[1] چونکہ سابق مترجمین قرآن زیادہ تر علمائے دین یا ادیب تھے جو جدید ترین سائنسی علوم اور انکشافات سے آگاہ نہ تھے' اس لیے وہ سورہ الذریٰت (۵۱) کی محولہ بالا آیت ۴۷ کے صحیح ترجمے کا حق ادا نہ کر سکے۔ تاہم محمد مارماڈیوک پکھتال اور عبداللہ یوسف علی اپنے انگریزی ترجموں میں صحیح مطلب کے قریب پہنچ گئے چنانچہ پکھتال نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا۔

"We built the heaven with might, and we it is make the vast extent (thereof)."

اور عبداللہ یوسف علی

"With power and did we construct the for it is we who crate the vastness of space."

یہ حضرات انگریزی زبان کی وساطت سے جدید سائنسی انکشافات سے ایک حد تک آگاہ تھے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ) جیساکہ اقبال تھے (ان کے شعر کا پہلے حوالہ دیا جاچکا ہے)۔ لیکن اردو مترجمین کی واماندگیاں قابلِ ملاحظہ ہیں۔ توسیع پذیر کے جدید تصور تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں:

مولانا اشرف علی تھانوی: "اور آسمانوں کو (اپنی) قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں۔"

مولانا فتح محمد جالندھری: "اور آسمانوں کو ہم ہی نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ہم کو سب مقدور ہے"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: "آسمانوں کو ہم نے اپنے زور سے بنایا اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں۔"

بہرحال قرآنی عبارات و آیات تہہ در تہہ معانی کی حامل ہیں اور یہ تہیں آہستہ آہستہ کھلتی جاتی ہیں قرآن بنی نوع انسان کے نام خدا کا آخری پیغام ہے۔ اس کی ابدیت کا یہی تقاضا ہے کہ ہر زمانے میں صداقت بکنار رہے۔

بہرحال اب سائنسدان کائنات اور مادہ کو ازلی و ابدی نہیں مانتے۔ اب وہ تخلیق مادہ اور تخلیق کائنات کے قائل ہو چکے ہیں۔ جب ان کا ایک خالق تسلیم کر لیا گیا تو وہ اپنی تخلیق پر اختیار کلی رکھتا ہے۔ لہٰذا کائنات کی توسیع عین ممکن ہے۔ مشہور ماہر فلکیات فریڈ ہائیل (Fred Hoyle) اپنی تصنیف "دی نیچر آف دی یونیورس" (کائنات کی ماہیت) کے صفحہ ۱۰۹ پر لکھتا ہے کہ "ہمارا آخری منتہیٰ یہ نظریہ ہے کہ ہر آن مادے کی تخلیق ہوتی رہتی ہے اور یہی نظریہ پوری طرح اطمینان بخش نظریہ ہے" آگے چل کر ص۱۱۱ پر لکھتا ہے کہ "اگر ایسا ہوتا (یعنی کائنات کا سارا مادہ ازلی ہوتا) تو آج کائنات میں ہائیڈروجن کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا پھر ایسا کیوں ہے کہ کائنات ہائیڈروجن سے بھرپور ہے۔ اگر مادہ ازلی ہوتا تو ایسا ہونا ناممکن تھا بس کائنات جیسی کچھ بھی ہے اس کے لحاظ سے تخلیق کائنات کے نظریے سے مفر نہیں۔ مشہور فلسفی اور ریاضی دان برٹرینڈ رسل نے اپنی کتاب "انڈراسٹینڈنگ ہسٹری" (تفہیم تاریخ) کے صفحہ ۱۱۱ پر لکھا ہے کہ "اب ایسے کوئی دلائل باقی نہیں جن سے یہ یقین کیا جا سکے کہ مادہ جیسی کوئی چیز موجود ہے۔ مترجم

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMATE
MAYOTTE

خلا کی تسخیر

اس سلسلے میں قرآن کی تین آیتیں ہماری پوری توجہ کی مستحق ہیں۔ ایک میں تو صاف صاف بتایا گیا ہے کہ اس میدان میں انسان کو کہاں تک پہنچنا اور کیا سرانجام دینا چاہیے اور وہ واقعتاً کہاں تک پہنچے گا اور کیا سرانجام دے گا، دوسرے دو آیتوں میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر کفارِ مکہ آسمانوں تک چڑھنے کے قابل ہوتے تو وہاں کس اچنبھے سے دوچار ہوتے؟ ان میں خدا ایک ایسے مفروضے کا کنایتہً ذکر کرتا ہے جو کفارِ مکہ کے لیے حقیقت کا روپ نہیں دھارے گا۔

(۱) ان آیات میں سے پہلی آیت سورہ الرحمٰن (۵۵) کی آیت ۳۳ ہے:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝

"O assembly of Jinus and men! If you can penetrate regions of the heaven and earth, then penetrate them! You will not penetrate them save with a power.

اردو ترجمہ: اے گروہ جن و انس! اگر تمھیں قدرت ہو کہ زمین و آسمان کے کناروں (حدود) سے نکل جاؤ، تو نکل جاؤ۔ مگر تم سلطان (غالب کرنے والی قوت) کے بغیر نہیں نکل سکتے۔"

یہاں جو انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے، اس پر کچھ توضیحی تبصرے کی ضرورت ہے۔

(ل) انگریزی میں لفظ 'If' (اگر) سے ایک ایسی شرط یا صورت حال کا اظہار ہوتا ہے جس کا اظہار ... امکان اور قابل حصول یا ناقابلِ حصول مفروضے پر ... عربی زبان میں یہ صلاحیت ہے ... لفظ شرط میں ایسا باریک معنوی فرق یا پہلو پیدا کر دے جو اس کے عام معنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ واضح ہو۔ امکان کے اظہار کے

لیے ایک لفظ (اِذَا) ہے، قابل حصول مفروضے کے لیے ایک دوسرا لفظ (اِنْ) ہے اور ناقابلِ حصول مفروضے کے لیے ایک تیسرا لفظ (لَو) ہے۔ آیت زیرِ بحث میں قابل حصول مفروضے کا اظہار لفظ 'اِنْ' سے کیا گیا ہے۔ اس سے قرآن ایک محسوس اور ٹھوس عمل پذیری (realizability) کے مادی امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے (یعنی زمین و آسمان کی حدود سے نکل جانا ممکن ہے۔ مترجم)۔ یہ نازک لسانی فرق آیت کی اس صوفیانہ تعبیر کو باقاعدہ طور پر خارج از بحث کر دیتا ہے جو بعض لوگوں نے غلط طور پر اس پر ٹھونس دی ہے۔

(ب) اس آیت میں خدا کا خطاب جن و انس یعنی جنوں اور انسانوں سے ہے ضروری نہیں کہ یہ پیرایۂ مجاز ہو۔

(د) 'To penetrate' عربی لفظ 'نفذہ' کا ترجمہ ہے جس کے بعد حرفِ جار 'مِنْ' آیا ہے۔ کازمیرسکی (Kazmirski) کی مرتبہ لغات کی رُو سے اس کے معنی ہیں "کسی جسم کے آر پار نکل جانا" (مثلاً ایک تیر جو دوسری طرف نکل جائے)۔ لہٰذا یہ اشارہ ہے آسمانوں میں گہرا نفوذ کرنے، گھس جانے اور دوسری طرف جا نکلنے کا۔

(س) اس منصوبے اور مہم کو انجام دینے کے لیے جس قوت (سلطان[1]) کی ضرورت

---

[1] 'سلطان' کے معنی ہیں زور، قوت، قدرت، برہان، سند، بادشاہ کی طاقت، بادشاہ کا دیا ہوا اختیار یا جاری کردہ پروانہ۔ محترمہ امت الکریم بیگم اسحاق آمنہ نے اپنے مضمون 'قرآن، انسان اور چاند' (مطبوعہ سیارہ ڈائجسٹ، قرآن نمبر، جلد ۲) میں لکھا ہے کہ "سلطان کے لفظ میں راکٹ کی شکل و صورت کا اشارہ بھی پوشیدہ ہے۔ وہ اس طرح کہ لفظ سلطان کے مادے یا روٹ کے حروف س، ل، ط سے ایک لفظ سلطہ مشتق ہوتا ہے (بنتا ہے) جس کے معنی ہیں وہ خاص طور سے تیر اور عناصر کہ جو بہت ہی تیزی کے ساتھ اپنی کمان سے نکل کر عین نشانے پر جا لگتا ہے۔" گویا قرآن کے ایک ایک لفظ میں جہاں معنی پوشیدہ ہے۔ مترجم

ہوگی وہ قادرِ مطلق کی طرف سے عطا ہوگی۔[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آیت سے اس امکان کا اشارہ ملتا ہے کہ ایک دن انسان وہ مہم سرانجام دے ہی لیں گے جسے آج ہم (شائد نادرست طور پر) "خلا کی تسخیر" کہتے ہیں۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ قرآنی عبارت میں صرف آسمانوں میں نفوذ کرنے اور پار نکل جانے ہی کی پیشین گوئی نہیں کی گئی بلکہ زمین میں نفوذ کرنے کی بھی یعنی اس کی گہرائیوں کی چھان بین کی بھی۔

(۲) دوسری دونوں آیات سورہ الحجر کی چودھویں اور پندرھویں آیتیں ہیں۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ۝ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ۔

جیسا کہ ان دونوں آیات کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، خدا کا خطاب کفارِ مکہ سے ہے:

"اور اگر ہم آسمان کا کوئی دروازہ ان پر کھول دیں اور وہ اس میں چڑھنے بھی لگیں تو بھی یہی کہیں گے کہ ہماری آنکھیں مخمور ہو گئی ہیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

یہ اظہارِ حیرت ہے ایک ایسے غیر معمولی منظر پر جو ان تمام مناظر سے مختلف ہے جن کا انسان تصور کر سکتا ہے۔

یہاں جملۂ شرطیہ کا آغاز لفظ 'لَوْ' سے کیا گیا ہے جو ایک ایسے مفروضے کا اظہار کرتا ہے جو ان آیات کے مخاطب لوگوں کے لیے بھی کبھی حقیقت کا روپ نہیں

---

[1] اس آیت کے بعد اللہ کی نعمتوں کا اعتراف کرنے کی دعوت ہے یعنی آیۃ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟) پوری سورۃ الرحمٰن کا یہی موضوع ہے مصنف 'سلطان' والی آیت کے فوراً بعد اس آیت کا ورود کرتا ہے کہ 'سلطان' کا عطا ہونا ایک نعمتِ خداوندی ہے جس کا انکار کرنا ناشکری ہوگی۔ مترجم

دھار سکتا تھا۔

لہذا جب ہم خلا کی تسخیر کی بات کرتے ہیں تو قرآن کی دو عبارتیں سامنے آتی ہیں ایک میں تو اس مفروضے کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی خداداد ذہانت اور قوتِ اختراع کے طفیل ایک دن حقیقت بن کر سامنے آئے گا اور دوسری میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جس کا مشاہدہ کفارِ مکہ کبھی نہیں کر سکیں گے۔ لہذا یہ ایک ایسی شرط ہے جو ان کے لیے کبھی واقعیت کا رنگ اختیار نہیں کرے گی۔ تاہم دوسرے لوگ اس واقعہ کا مشاہدہ کریں گے جیسا کہ محولا بالا پہلی آیت میں خبر دی گئی ہے۔ اس میں انسانی ردعمل کا بیان ہے جو خلا کے مسافر غیر متوقع منظر دیکھ کر ظاہر کریں گے یعنی ان کی پریشاں نظری جیسے نشے میں ہوں اور سحر زدگی کا احساس۔

۱۹۶۱ء میں جب پہلی خلائی پرواز کا آغاز ہوا تب سے اپنی غیر معمولی مہمات میں خلا بازوں کو بالکل اسی قسم کا تجربہ ہوا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب انسان ایک دفعہ زمین کی کرۂ ہوائی سے اوپر نکل جاتا ہے تو آسمانوں کی وہ نیلگوں رنگت نہیں رہتی جو ہمیں زمین سے دکھائی دیتی ہے اور جو کرۂ ہوائی کی تہوں میں سورج کی روشنی کے جذب ہونے سے منتج ہوتی ہے۔ زمین کے کرہ ہوائی سے اوپر خلا میں پہنچ کر ناظر کو آسمان کالا دکھائی دیتا ہے اور زمین کے گرد ایک نیلگوں ہالہ نظر آتا ہے اس کی وجہ بھی وہی ہوتی ہے کہ زمین کے کرۂ ہوائی میں سورج کی روشنی جذب ہو کر یہ رنگت پیدا کرتی ہے لیکن چاند کا کوئی اپنا کرۂ ہوائی نہیں ہے۔ اس لیے وہ آسمان کی سیاہ بیک گراؤنڈ میں اپنے اصلی رنگوں میں دکھائی دیتا ہے لہذا یہ ایک بالکل نیا منظر ہے جو خلا بازوں کے سامنے آتا ہے اور ہمارے عہد کے لوگ اس منظر کے فوٹوؤں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

یہاں پھر جب ہم قرآنی عبارات کا جدید سائنسی معلومات سے مقابلہ کرتے ہیں تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ یہ ایسے بیانات ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے کے ایک انسان کے اپنے ذاتی خیالات کا نتیجہ ہو ہی نہیں سکتے۔

۵

زمین

جس طرح گزشتہ صفحات میں زیرِ بحث آنے والے مضامین کے بارے میں آیات قرآن میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں، اسی طرح زمین کے متعلق آیات اکٹھی ایک جگہ نہیں ملتیں، بلکہ مختلف سورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان آیات کی درجہ بندی کرنا مشکل ہے۔ یہاں جو اسکیم اختیار کی گئی ہے، اس کی حیثیت ذاتی قسم کی ہے۔

ان کی بہتر طور پر وضاحت کرنے کے لیے ہم بعض ایسی آیات سے شروع کرتے ہیں جن میں بیک وقت ایک سے زیادہ موضوعات سے بحث کرتی ہیں۔ آیات اپنی تطبیق و مناسبت کے لحاظ سے عمومی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں انسانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ ان میں دی گئی مثالوں پر غور کر کے لطف و رحمتِ خداوندی کا تصور اور احساس کریں۔

موضوع کے لحاظ سے دوسری آیات کی گروہ بندی اس طرح کی جا سکتی ہے:

۱۔ وہ آیات جو دورانِ آب اور سمندروں سے بحث کرتی ہیں۔

۲۔ وہ آیات جو زمین کی شکل و صورت، دریاؤں، پہاڑوں وغیرہ (ریلیف Relief) سے بحث کرتی ہیں۔

۳۔ وہ آیات جو زمین کے کرۂ ہوائی سے بحث کرتی ہیں۔

۱۔ عوامی بیانات کی حامل آیات

اگرچہ ان آیات میں ایسے دلائل دیئے گئے ہیں جن کا مقصد انسان کو خدا کی اپنی مخلوق پر رحمت و ربوبیت کے متعلق غور و فکر کرنے پر مائل کرنا ہے، تاہم کہیں کہیں ان میں ایسے بیانات ملتے ہیں جو جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے دلچسپ ہیں۔ چونکہ ان میں مظاہرِ فطرت کے بارے میں نزولِ قرآن کے وقت کے متداول اعتقادات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، اس لیے وہ شاذ خصوصی طور پر انکشافات انگیز ہیں۔ بعد میں سائنس نے ان اعتقادات کو باطل ثابت کر دیا۔

ایک طرف تو یہ آیات سیدھے سادے تصورات و خیالات کا اظہار کرتی ہیں جنھیں قرآن کے اولین مخاطبین (جغرافیائی وجوہات کی بنا پر) آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ یعنی مکہ اور مدینہ کے باشندے اور جزیرہ نمائے عرب کے بدو۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ ان میں عام نوعیت کا غور و فکر پایا جاتا ہے جس سے کسی بھی زمانے اور ملک کی نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب پبلک کچھ سبق آموز باتیں سیکھ سکتی ہے بشرطیکہ ایک دفعہ ان کے متعلق سوچ بچار شروع کرے۔ اور یہ قرآن کی عالمگیر حیثیت اور پیغام کی ایک علامت ہے۔

چونکہ بظاہر قرآن میں ایسی آیات کی درجہ بندی نہیں کی گئی، اس لیے انہیں یہاں سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے پیش کیا جاتا ہے۔

سورہ البقرۃ، آیت ۲۲

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: (خدا وہ ہے) جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لیے انواع و اقسام کے میوے پیدا کیے پس کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔ اور تم جانتے تو ہو۔

سورۃ البقرۃ، آیت ۱۶۴:-

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ

اَللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا
مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کے لیے رواں ہیں اور مینہ میں جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز) کر دیتا ہے۔ اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے اور ہواؤں کے پھیلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں، عقلمندوں کے لیے (خدا کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔

سورۃ الرعد، آیت ۳:

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ
الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا پیدا کیے اور ہر طرح کے میوؤں کی دو دو قسمیں بنائیں۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے۔ غور کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

سورۃ الحجر، آیات ۱۹ تا ۲۱، خدا بول رہا ہے:

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ○ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ
لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ○ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَاۗىِٕنُهٗ
وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ○

ترجمہ: اور زمین کو بھی ہم ہی نے پھیلایا اور اس پر پہاڑ (بنا کر) رکھ دیے اور اس میں ہر ایک سنجیدہ چیز اگائی۔ اور ہم ہی نے تمہارے لیے اور ان لوگوں کے لیے جن کو تم روزی نہیں دیتے اس میں معاش کے سامان پیدا کیے۔ اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم ان کو معین مقدار میں اتارتے رہتے ہیں۔

سورۂ طٰهٰ، آیات ۵۳-۵۴

اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا
سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا
مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ○ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّاُولِي النُّهٰى ○

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے تم لوگوں کے لیے زمین کو فرش بنایا اور اس میں تمہارے لیے رستے جاری کیے اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے انواع و اقسام کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں (کہ خود بھی) کھاؤ اور اپنے چوپایوں کو بھی چراؤ۔ بے شک ان (باتوں) میں عقل والوں کے لیے (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

سورۃ النمل، آیت ۶۱:

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ
لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ: بھلا کس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے بیچ نہریں بنائیں اور اس کے لیے پہاڑ بنائے اور (کس نے) دو دریاؤں کے بیچ اوٹ بنائی (یہ سب کچھ خدا نے بنایا) تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ہرگز نہیں) بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں۔

یہاں قشرِ زمین (crust) کی عمومی محکمی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ بات معلوم ہے کہ زمین کے وجود کے ابتدائی مرحلوں میں جب اس کا قشر ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا، یہ غیر محکم تھی۔ تاہم قشرِ زمین کی محکمی ہر جگہ یکساں نہیں ہے کیونکہ ایسے خطے موجود ہیں جہاں وقفے وقفے سے زلزلے آتے رہتے ہیں۔ جہاں تک دو سمندروں کے درمیان اوٹ کا تعلق ہے، یہ ایک استعارہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ بڑے دریاؤں اور سمندروں کے پانی بعض بڑے دہانوں کی سطح پر آپس میں ملتے نہیں۔[1]

سورۃ الملک، آیت ۱۵:۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو مسخر کیا۔ اس کی راہوں میں چلو پھرو اور خدا کا (دیا ہوا) رزق کھاؤ اور (تم کو) اسی کے پاس (قبروں سے) نکل کر جانا ہے۔

سورۃ النّٰزعٰت (۷۹) آیات ۳۰ تا ۳۳:۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

ترجمہ: اور اس کے بعد زمین کو پھیلا دیا۔ اسی نے اس میں سے اس کا پانی نکالا اور چارہ اگایا اور اس پر پہاڑوں کا بوجھ رکھ دیا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے فائدے کے لیے (کیا)۔

---

[1] دریا کے سمندر میں گرنے کے بعد بھی کافی دور تک دریا اور سمندر کا پانی ایک دوسرے سے الگ بہتا دکھائی دیتا ہے۔ مترجم نے خود یہ منظر مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کی بندرگاہ چٹاگانگ میں دیکھا کہ دریائے کرنافلی کے پانی کا دھارا سمندر میں گرنے کے بعد بھی کافی دور تک الگ بہتا دکھائی دیتا ہے۔ مترجم

ایسی بہت سی آیات ہیں۔ پانی کی اہمیت اور زمین میں اس کی موجودگی کے عملی نتائج، یعنی مٹی کی زرخیزی، پر زور دیا گیا ہے، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ صحرائی ممالک میں انسان کی بقا کے لیے پانی سب سے اہم چیز ہے، لیکن قرآن میں پانی کا حوالہ اس جغرافیائی خصوصیت اور تفصیل سے آگے تک جاتا ہے۔ سائنسی معلومات کی رو سے زمین کی یہ خصوصیت کہ وہ ایک ایسا سیارہ ہے جس پر پانی کی افراط ہے، نظامِ شمسی میں اپنی مثال نہیں رکھتی اور یہی وہ خصوصیت ہے جسے قرآن میں نمایاں کیا گیا ہے۔ پانی کے بغیر زمین بھی چاند کی طرح ایک بے جان اور مردہ سیارہ ہوتی۔ جن زمینی مظاہرِ فطرت کا ذکر قرآن کرتا ہے ان میں پانی کو اولیت دیتا ہے۔ قرآن میں دورانِ آب (water cycle) کا بیان حیرت انگیز صحت سے کیا گیا ہے۔

ب۔ دورانِ آب اور سمندر

انسانی زندگی میں پانی کے کردار کے متعلق جب قرآنی آیات یکے بعد دیگرے پڑھی جاتی ہیں تو وہ ایسے خیالات و تصورات کی حامل نظر آتی ہیں جو آج بیشتر یا افتادہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ آج کل ہم سب کم و بیش جانتے ہیں کہ قدرت نے دورانِ آب (water cycle) کا انتظام کر رکھا ہے۔

لیکن اگر ہم اس موضوع پر قدما کے مختلف نظریات پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی فراہم کردہ معلومات ان دیومالائی تصورات سے مبرا ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت رائج و متداول تھے لیکن مظاہرِ فطرت کے مشاہدے پر مبنی ہونے کے بجائے فلسفیانہ قیاس آرائی کا نتیجہ تھے۔ اگرچہ تجرباتی لحاظ سے یہ ممکن تھا کہ زرعی آبپاشی کو بہتر بنانے کے لیے ضروری اور مفید عملی معلومات ایک واجبی حد تک حاصل کی جا سکیں، لیکن دورانِ آب کے بارے میں جو عمومی تصورات رائج تھے وہ آج قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔

اس طرح یہ فرض کر لینا آسان تھا کہ زمین کے نیچے کا پانی کثیف بخارات (Precipi-tations) کے زمین میں سرایت کر جانے سے پیدا ہوتا ہے لیکن پہلی صدی قبل مسیح میں روم کے وٹروویئس پولیو مارکس (Vitruvius Polio Marcus) کے اس خیال کو ایک استثنائی حیثیت دی جاتی تھی، اس لیے کئی صدیوں تک (اور قرآن اسی دوران میں نازل ہوا) دورانِ آب (Water Cycle) کے بارے میں انسان کے خیالات و تصورات بالکل غلط تھے۔

دورانِ آب کے متعلق خصوصی ماہرانہ علم رکھنے والے دو حضرات جی گستانی (G. Castany) اور بی بلاوُد (B. Blavoux) نے عالمی انسائیکلوپیڈیا (Universalis Encyclopaedia) میں 'آبی ارضیات' (Hydrogeology) کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، اس میں انھوں نے اس مسئلے کی بڑی روح پرور تاریخ بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ساتویں صدی قبل مسیح میں میلیٹس (Miletus) کے تھیلس (Thales) کا یہ نظریہ تھا کہ ہوائیں سمندروں کے پانی کو براعظموں کے اندر کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔ اس طرح پانی زمین پر پڑنے سے مٹی کے اندر نفوذ کر جاتا ہے۔ افلاطون بھی اس کا ہم خیال تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایک عظیم عمیق یا پاتال (great abyss) موسوم طرطاروس (Tartarus) کے ذریعے پانی سمندروں کو واپس چلا جاتا ہے اٹھارہویں صدی عیسوی تک اس نظریئے کے بہت سے حامی موجود تھے۔ ان میں سے ایک ڈیکارٹے (Descartes) بھی تھا۔ ارسطو کا خیال تھا کہ زمین سے اٹھنے والے آبی بخارات پہاڑوں کے سرد غاروں میں منجمد ہوتے ہیں اور زیر زمین جھیلوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یوں چشموں کو پانی فراہم ہوتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں سینکا (Seneca) اور پھر بہت سے دوسروں کا بھی یہی خیال تھا۔ ۱۸۷۷ء تک یہی کیفیت رہی۔ ان بہت سوں میں او۔ وولگر (O. Volger) بھی

شامل تھا[1]۔ دورانِ آب کے متعلق سب سے پہلے واضح نظریہ ۱۵۸۰ء میں پالیسی (Palissy) نے پیش کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ زیر زمین پایا جانے والا پانی دراصل بارش کا پانی ہوتا ہے جو زمین میں سرایت کر گیا ہوتا ہے۔ سترھویں صدی میں ای میریٹ (E. Marriotte) اور پی پیرالٹ (P. Perrault) نے اس نظریئے کی تائید و تصدیق کی۔"

قرآن کی حسب ذیل عبارتوں میں ان غلط تصورات و نظریات کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں پائے جاتے تھے:

سورۂ ق (۵۰) آیات ۹ تا ۱۱

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الحصید ○ والنخل بٰسقٰت لها طلع نضید ○ رزقا للعباد واحیینا به بلدة میتا كذلك الخروج ○

ترجمہ: اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا اور اس سے باغ و بستان اگائے اور کھیتی کا اناج اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہہ بہ تہہ ہوتا ہے۔ (یہ سب کچھ) بندوں کو روزی دینے کے لیے کیا ہے)۔ اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی افتادہ زمین) کو زندہ کیا۔ (بس) اسی طرح قیامت (کے روز قبروں سے) نکل پڑنا ہے۔

سورۂ المومنون (۲۳) آیات ۱۸-۱۹

وانزلنا من السماء ماء بقدر فاسکنه فی الارض وانا علی ذهاب به لقدرون ○ فانشانا لکم به جنت من نخیل واعناب

---

[1] افلاطون، ارسطو، سینکا وغیرہ مشہور و معروف فلسفی اور مفکر ہیں۔ ارسطو تو سائنس داں بھی تھا آج دورانِ آب کے بارے میں ان کے خیالات کیسے مضحکہ خیز اور بچگانہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں قرآن ابدی صداقتوں کا حامل ہے۔ انسانی فکر اور آسمانی تنزیل کا یہی فرق ہے۔ مترجم

لکم فیھا فواکہ کثیرۃ و منھا تاکلون ۵

ترجمہ: اور ہم ہی نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی نازل کیا۔ پھر اس کو زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم اس کے نابود کر دینے پر بھی قادر ہیں۔ پھر ہم نے اس سے تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ بنائے۔ ان میں تمہارے لیے بہت سے میوے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے ہو۔

سورۃ الحجر (۱۵) آیت ۲۲

وارسلنا الریٰح لواقح فانزلنا من السماء ماء فاسقینکموہ
وما انتم لہ بخازنین ۵

ترجمہ: اور ہم ہی ہوائیں چلاتے ہیں جو (بادلوں کے پانی سے) بھری ہوئی ہوتی ہیں اور ہم ہی آسمان سے مینہ برساتے ہیں اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔

اس آخری آیت کی دو ممکنہ تفسیریں ہو سکتی ہیں۔ بارآور کرنے والی ہواؤں کو پودوں کو زرخیز کرنے والی (کھاد) بھی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھ زردانہ لاتی ہیں۔ لیکن یہ ایک استعاراتی طرز بیان بھی ہو سکتا ہے اور تمثیلی استدلال سے ہوا کے اس کردار کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جو وہ کسی غیر بارانی بادل (Non-rain carrying cloud) کو ابر باراں میں تبدیل کرنے کے عمل میں ادا کرتی ہے۔ ہوا کے اس کردار کی طرف قرآن میں اکثر اشارہ کیا گیا ہے جیسا کہ حسب ذیل آیات ہیں۔

سورۃ فاطر (۳۵) آیت ۹:

واللہ الذی ارسل الریٰح فتثیر سحابا فسقنٰہ
الی بلد میت فاحیینا بہ الارض بعد موتھا کذلک
النشور ۵

ترجمہ: اور خدا ہی تو ہے جو ہوائیں چلاتا ہے اور وہ بادل کو ابھارتی ہیں

پھر ہم اس کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں۔ پھر اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کو بھی اٹھنا ہوگا۔

غور کیجیے کہ آیت کے پہلے حصے کا اسلوب کیسا بیانیہ ہے۔ اور پھر کسی عبوری بیان یا تغیری کیفیت کے بغیر اعلانِ خداوندی تک پہنچ جاتا ہے۔ اسلوب بیان کی ایسی اچانک تبدیلیاں قرآن میں اکثر ملتی ہیں۔

سورۃ الروم (۳۰) آیت ۴۸:

اللہ الذی یرسل الریٰح فتثیر سحابا فیبسطہ فی السماء
کیف یشاء ویجعلہ کسفا فتری الودق یخرج من خللہ
فاذا اصاب بہ من یشاء من عبادہ ۵ اذا ھم یستبشرون ۵

ترجمہ:: خدا ہی تو ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے تو وہ بادل کو ابھارتی ہیں پھر خدا اس کو جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے بیچ میں سے مینہ نکلنے لگتا ہے۔ پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے اسے برسا دیتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

سورۃ الاعراف (۷) آیت ۵۷

وھو الذی یرسل الریح بشرا بین یدی رحمتہ حتی اذا
اقلت سحابا ثقالا سقنہ لبلد میت فانزلنا بہ الماء فاخرجنا
بہ من کل الثمرات کذلک نخرج الموتی لعلکم تذکرون ۵

ترجمہ۔ اور وہی تو ہے جو اپنی رحمت (یعنی مینہ) سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب وہ بھاری بھاری بادلوں کو اٹھا لاتی ہیں تو ہم اس بادل کو

نوٹ:۔ قرآنی آیات میں جہاں کہیں لفظ 'ہم' آتا ہے، اس سے مراد خدا ہوتا ہے۔ مصنف

کسی مری ہوئی بستی (خشک سرزمین) کی طرف ہانک دیتے ہیں۔ پھر بادل سے پانی برساتے ہیں۔ پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو (زمین سے) زندہ کر کے باہر نکالیں گے۔ (یہ آیات اس لیے بیان کی جاتی ہیں) تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

سورۃ الفرقان (۲۵) آیات ۴۸-۴۹:

وھو الذی ارسل الریح بشرا بین یدی رحمتہ ج وانزلنا من السماء ماء طھورا لا لنحی بہ بلدۃ میتا ونسقیہ مما خلقنا انعاما واناسی کثیرا ۵

ترجمہ:- اور وہی تو ہے جو اپنی رحمت کے مینہ کے آگے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے اور ہم آسمان سے پاک (اور ستھرا ہوا) پانی برساتے ہیں۔ تاکہ اس شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کر دیں اور پھر ہم اسے بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو جو ہم نے پیدا کیے ہیں، پلاتے ہیں۔

سورۃ الجاثیہ (۴۵) آیت ۵:-

واختلاف الیل والنھار وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتھا وتصریف الریح ایت لقوم یعقلون ۵

ترجمہ: اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں اور وہ جو خدا نے آسمان سے (ذریعۂ) رزق نازل فرمایا پھر اس سے زمین کو اس کے مر جانے کے بعد زندہ کیا اس میں اور ہواؤں کے بدلنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اس آخری آیت میں رزق کا انتظام آسمان سے برسنے والے پانی کی صورت میں کیا گیا ہے۔ یہاں ہواؤں کی تبدیلی پر زور دیا گیا ہے جو دورانِ آب میں جزوی تغیر و تبدل کرتی ہیں۔

سورۃ الرعد (۱۳) آیت ۱۷:

انزل من السماء ماء فسالت اودیۃ بقدرھا فاحتمل السیل زبدا رابیا ط

ترجمہ:- اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔ پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے۔

سورۃ الملک (۶۷) کی آیت ۳۰ میں اللہ اپنے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیتا ہے:

قل ارءیتم ان اصبح ماؤکم غورا فمن یاتیکم بماء معین ۵

ترجمہ: (اے پیغمبرؐ) کہو کہ بھلا دیکھو تو اگر تمہارا پانی (جو تم پیتے ہو اور برتتے ہو) خشک ہو جائے تو (خدا کے سوا) کون ہے جو تمہارے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہا لائے؟

سورۃ الزمر (۳۹) آیت ۲۱:

الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فسلکہ ینابیع فی الارض ثم یخرج بہ زرعا مختلفا الوانہ۔

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا پھر اس سے کھیتی اگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔

سورۃ یٰسٓ (۳۶) آیت ۳۴:

وجعلنا فیھا جنت من نخیل واعناب وفجرنا فیھا من العیون ۵

ترجمہ: اور (ہم نے) اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس میں چشمے جاری کر دیے۔

مندرجہ بالا آخری تین آیات میں چشموں اور ان میں بارش کے پانی کی فراہمی کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہاں ہمیں توقف کر کے اس حقیقتِ واقعہ کی جانچ پڑتال کرنی چاہیے اور ارسطو اور ازمنۂ وسطیٰ کے متداول تصورات کے غلبہ وا   کو ذہن میں لانا چاہیے ارسطو کا خیال تھا کہ چشموں میں پانی زیر زمین جھیلوں سے آتا ہے۔ زرعی مشاغل کے

فرانسیسی قومی اسکول (French National School of Agriculture) کے استاد ایم۔آر۔ایمی تیراس (M.R.Remenieras) نے عالمی انسائیکلوپیڈیا (Universal-Encyclopaedia) میں "مائیات" (Hydrology) کے موضوع پر جو مضمون لکھا ہے، اس میں اس نے مائیات کے بڑے بڑے مراحل بیان کیے ہیں اور قدماء کے، خاص کر مشرق وسطیٰ میں، آبپاشی کے شاندار منصوبوں کا ذکر کیا ہے، لیکن چونکہ اس زمانے کی سوچوں اور منصوبوں کی بنیاد غلط تصورات پر تھی، اس لیے ہر معاملے میں تجرباتی (Empirical) نقطۂ نظر حاوی تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"خالص فلسفیانہ تصورات کی جگہ مائیاتی مظاہر کے معروضی مشاہدے پر مبنی تحقیق کو یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور احیائے علوم (سنہ ۱۴۰۰ء اور سنہ ۱۶۰۰ء کے درمیان کی تحریک سے پہلے مل سکی[۱]۔ لیونارڈو۔ڈاونسی (۱۴۵۲ء تا ۱۵۱۹ء) نے ارسطو کے خیالات کے خلاف بغاوت کی۔ برنارڈ پالیسی نے اپنے مضمون معنونہ "پانیوں اور چشموں (قدرتی اور مصنوعی) کے بارے میں ایک حیرت انگیز مقالہ" (مطبوعہ پیرس، ۱۵۷۰ء)

(Wonderful discausse on the nature of Water and fountains both natural and artificial.)

میں دوران آب کی صحیح توجیہ کی ہے۔ خاص کر جس طریقے سے چشموں کو بارش کا پانی فراہم ہوتا ہے۔"

یہ آخری بیان بالکل اس بیان سے مشابہ ہے جو سورہ ۳۹ کی آیت ۲۱ میں بارش کے پانی کے زمین کے سوتوں میں جانے کے متعلق ملتا ہے۔ چوبیسویں سورت (النور)

---

[۱] یورپ میں تحریک احیائے علوم اور نتیجۃً نشاۃ ثانیہ کا آغاز بالعموم ترکوں کی فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) کے بعد مانا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے یورپی ممالک کے بہت سے لوگ اسپین کی اسلامی درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے ممالک میں اسلامی علم و حکمت کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ لہٰذا نشاۃ ثانیہ کا باعث قسطنطنیہ سے یونانیوں کا یورپ کو فرار نہ تھا۔ مترجم

کی آیت ۴۳ کا موضوع بارش اور اولے ہیں:۔

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا ہی بادلوں کو چلاتا ہے پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے پھر ان کو تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل کر برس رہا ہو اور اسی بادل سے یعنی اس کے بڑے بڑے حصوں سے اولے برساتا ہے پھر ان کو جس کی جان یا مال پر چاہتا ہے، گراتا ہے اور جس سے چاہتا ہے، ہٹا رکھتا ہے اور بادل میں جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر کے بینائی کو اچک لیے جاتی ہے۔"

سورۃ الواقعہ (۵۶) کی حسب ذیل عبارت (آیات ۶۸۔۷۰) قدرے تبصرہ و تفسیر کی محتاج ہے:۔

"بھلا دیکھو تو کہ جو پانی تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا ہے یا ہم نازل کرتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری کر دیں۔ پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟"

زمین

یہ اشارہ کہ اگر خدا چاہتا تو میٹھے پانی کو کھاری پانی میں تبدیل کر دیتا، خدا کی قدرت کاملہ کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ خدا کی قدرت کاملہ کی طرف ہمارے ذہنوں کو متوجہ کرنے کا ایک دوسرا طریقہ انسان کو یہ چیلنج دیتا ہے کہ وہ بادلوں سے مینہ برسا کر دکھائے۔ دور حاضر میں ترقی یافتہ ٹکنالوجی کے طفیل مصنوعی طور پر مینہ برسانا ممکن ہو گیا ہے۔ لیکن کیا اس بنا پر قرآن کے اس بیان کی مخالفت کی جا سکتی ہے کہ انسان تکثیف بخارات پیدا کر کے مینہ برسانے کی اہلیت نہیں رکھتا؟

اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس میدان میں انسانی تحدیدات و تقییدات (limitations) کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔ فرانسیسی دفتر موسمیات کے ایک ماہر ایم۔ اے۔ فیسی نے عالمی انسائیکلوپیڈیا (Universal Encyclopaedia) میں تکثیف بخارات" (Precipitations) کے زیر عنوان لکھتے ہوئے کہا ہے کہ کسی

ایسے بادل سے مینہ برسانا کبھی ممکن نہیں ہوگا جو بارانی بادل (rain clouds) کی خصوصیات سے عاری ہو یا ارتقائی پختگی کے مناسب مرحلے تک نہ پہنچا ہو۔"

اس لیے انسان تکنیکی ذرائع سے تکثیف بخار کے عمل کو کبھی تیز تر نہیں کر سکتا جب کہ اس کے قدرتی حالات موجود نہ ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو عملاً خشک سالی کبھی وقوع میں نہ آتی، حالانکہ ظاہر ہے کہ خشک سالیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ لہذا بارش اور کھرے موسم پر کنٹرول حاصل کرنا ابھی تک محض ایک خواب ہی ہے۔

انسان اپنے قصد و ارادے سے اس مقررہ چکر یا سائیکل کو توڑ نہیں سکتا جو نظام قدرت میں پانی کی گردش کو برقرار رکھتا ہے۔ مائیات کے متعلق جدید نظریات کے مطابق اس چکر یا سائیکل کو مختصر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

سورج کی شعاعوں سے پیدا شدہ حرارے سمندر اور سطح زمین کے ان حصوں پر جہاں پانی کھڑا ہو، تبخیر کا عمل کرتے ہیں اور پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے۔ پانی کے یہ بخارات فضا میں بلند ہوتے ہیں اور عمل انجماد سے بادلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، تب ہوائیں مداخلت کرتی ہیں اور ان بادلوں کو مختلف اطراف اور فاصلوں پر لے جاتی ہیں۔ تب یا تو بادل مینہ برسائے بغیر منتشر ہو جاتے ہیں یا دوسرے بادلوں کے ساتھ مل کر اور بھی بڑا انجماد و تکاثف پیدا کرتے ہیں یا ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے ارتقا کے کسی مرحلے پر مینہ برساتے ہیں۔ جب مینہ کا پانی سمندر میں پہنچتا ہے (۷۰ فیصد سطح زمین پر سمندر چھائے ہوئے ہیں[1] تو پھر وہی تبخیر، تکثیف، انجماد وغیرہ کا چکر دہرایا جاتا ہے) جب زمین پر مینہ برستا ہے، تو اس کے ایک حصے کو روئیدگی جذب کر لیتی ہے جس سے سبزہ و نباتات کی نشوونما میں مدد ملتی ہے۔ اپنی باری پر یہ روئیدگی بھی پانی چھوڑتی ہے اور اس طرح کچھ پانی فضا کو واپس دے دیتی ہے۔ بقیہ پانی کم و بیش زمین میں سرایت کر جاتا ہے جہاں سے وہ یا تو کھاڑیوں وغیرہ کے ذریعے سمندر میں پہنچ جاتا ہے یا چشموں وغیرہ کی صورت میں پھر

۱؎ اسی لیے ہمارے قدما خشکی کو "ربع مسکون" یعنی زمین کا ۲۵ فیصد قابل آبادی حصہ کہتے چلے آئے ہیں۔ مترجم

سے زمین کی سطح پر آ نکلتا ہے۔

جب ہم مائیات کے متعلق جدید معلومات کا مقابلہ قرآن کی محولہ بالا متعدد سورتوں کے بیانات سے کرتے ہیں تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دونوں میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔

سمندر

قرآن کی مندرجہ بالا آیات قدرت کے دوران آب کے متعلق جدید سائنسی معلومات سے مقابلے کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں۔ لیکن سمندروں کے بارے میں قرآن میں کوئی ایسا بیان نہیں ملتا جس کا مقابلہ جدید سائنسی حقائق سے کیا جا سکتا۔ تاہم سمندروں سے متعلق قرآن میں کوئی ایسا بیان بھی نہیں ملتا جس میں ان اعتقادات، خرافات اور توہمات کی طرف اشارہ ہو جو اس کے زمانۂ نزول میں سمندروں کے متعلق مروج تھے۔

متعدد آیتوں میں سمندروں اور جہاز رانی کا ذکر ہے۔ اور ان میں جہاز رانی خدا کی قدرت کاملہ کے مظاہر میں سے ہیں جو عام شاہدے کی چیز بنی ہیں۔

مثال کے طور پر حسب ذیل آیتوں کو لیجیے:

سورۂ ابراہیم (۱۴) آیت ۳۲:

"اور (اللہ نے) کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے زیر فرمان کیا تاکہ دریا اور سمندر میں اس کے حکم سے چلیں۔"

سورۂ النحل (۱۶) آیت ۱۴:

"اور وہی تو ہے جس نے سمندر کو تمہارے اختیار میں کیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے زیور (موتی) نکالو جسے تم پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر میں پانی کو چیرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس لیے بھی (دریاؤں اور سمندروں کو تمہارے اختیار میں کیا) کہ تم خدا کا فضل (رزق معاش) تلاش کرو تاکہ اس کا شکر کرو۔"

سورۂ لقمان (۳۱) آیت ۳۱:

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا ہی کی مہربانی سے کشتیاں اور جہاز سمندروں، دریاؤں میں چلتے ہیں۔ تاکہ وہ تم کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ بے شک اس میں ہر صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں۔"

سورۃ الرحمن (۵۵) آیت ۲۴

"اور جہاز بھی اسی کے ہیں جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔"

سورۃ یٰسٓ (۳۶) آیات ۴۱-۴۴:

"اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ اور ان کے لیے ویسی ہی اور چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ تو ان کا کوئی فریاد رس ہو اور نہ ان کو رہائی ملے۔ مگر یہ ہماری ہی مہربانی ہے اور ان کو ایک وقت معین تک فائدہ دینا (منظور) ہے۔"

یہاں واضح طور پر اشارہ انسانوں کو لے کر سمندر میں چلنے والی کشتی کی طرف ہے جیسا کہ مدتوں پہلے نوحؑ اور ان کے رفقا کشتی نوحؑ میں سوار ہو کر طوفان سے بچ نکلے تھے اور پھر خشکی پر پہنچ گئے تھے۔

سمندر کے متعلق مشاہدے میں آنے والی ایک اور حقیقت بھی اپنی غیر معمولی نوعیت کی وجہ سے قرآنی آیات سے نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے یعنی تین آیتوں میں بعض خصوصیات کا ذکر ہے جو بڑے دریاؤں میں مشترک ہوتی ہیں جب وہ سمندر میں گرتے ہیں۔

یہ منظر یا مظہر جانا پہچانا ہے اور اکثر مشاہدے میں آتا ہے کہ سمندر کا کھاری پانی اور اس میں گرنے والے دریاؤں کا میٹھا پانی فوری طور پر باہم مل نہیں جاتے۔ قرآن میں اس کا جس طرح ذکر آیا ہے اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ اشارہ دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے اتصال سے ہے کہ وہاں سے وہ ایک ساتھ مل کر سو میل تک شط العرب کہلاتے ہیں اور شط العرب بھی ایک طرح کا سمندر ہی ہے۔ خلیج فارس کے اندرونی حصوں میں جوار (tide) کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دریا (شط العرب) کا میٹھا تازہ پانی

تک زمین کی طرف بہاؤ کی صورت میں واپس مڑ جاتا ہے جو زرعی آبپاشی کے لیے ایک نعمت ہے۔ قرآنی آیت کے متن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ انگریزی لفظ 'سی' (sea) عربی لفظ 'بحر' کے عمومی معنی کو ادا کرتا ہے اور 'بحر' سے مراد پانی کا بہت بڑا اور وسیع ذخیرہ ہے۔ یہ عربی لفظ نہ صرف سمندر (sea) کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ بڑے دریاؤں کے لیے بھی مثلاً نیل، دجلہ، فرات وغیرہ۔

حسب ذیل تین آیتیں اس مظہر کی تصویر کشی کرتی ہیں:

سورۃ الفرقان (۲۵) آیت ۵۳:-

"اور وہ اللہ ہی تو ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا۔ ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھاری چھاتی جلانے والا۔ اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی۔"

سورۃ فاطر (۳۵)، آیت ۱۲:

"اور دونوں دریا (مل کر) یکساں نہیں ہو جاتے۔ یہ تو میٹھا ہے پیاس بجھانے والا، جس کا پانی خوشگوار ہے اور یہ کھاری ہے کڑوا۔ اور سب سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو اور (زیور) موتی نکالتے ہو جسے تم پہنتے ہو۔"

سورۃ الرحمٰن (۵۵) آیت ۱۹، ۲۰ اور ۲۲:-

"اسی نے دو دریا رواں کیے جو آپس میں ملتے ہیں۔ دونوں میں ایک آڑ ہے کہ (اس سے) تجاوز نہیں کر سکتے۔ دونوں دریاؤں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔"

بڑی حقیقت واقعہ کو بیان کرنے کے علاوہ ان آیتوں میں یہ بھی اشارہ ہے کہ میٹھے پانی اور کھاری پانی سے کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مچھلی اور آرائش کی چیزیں مونگے اور موتی۔ جہاں تک دہانے پر دریا کے پانی اور سمندری پانی کے آپس میں نہ ملنے کا تعلق ہے یہ مظہر دجلہ اور فرات سے مخصوص نہیں[1]۔ متن قرآن میں ان دریاؤں کا نام لے کر ذکر نہیں

---

[1] مترجم چٹاگانگ میں دریائے کرنافلی کے دہانے کے مشاہدے کا ذکر پہلے کر چکا ہے۔ مترجم

کیا گیا لیکن خیال ہے کہ انہی کی طرف اشارہ ہے[1]۔ ورنہ ان سے بھی بڑے بہاؤ کے دریا (مثلاً مس سیپی[2] اور ینگ سی[3]) بھی یہی خصوصیت رکھتے ہیں۔ اور سمندر میں گرنے کے بعد ان کا پانی بھی سمندر کے کھاری پانی سے کافی دور تک نہیں ملتا۔

ج ۔ زمین کے طبعی خط و خال

زمین کی بناوٹ بہت پیچیدہ ہے۔ آج ہم اسے یوں تصور کر سکتے ہیں کہ اس کی تہہ بہت گہری اور موٹی ہے جس کا درجۂ حرارت بہت اونچا ہے اور خاص طور پر اس کے مرکزی حصے میں اب بھی چٹانیں پگھلاؤ اور باہمی آمیزش کے عمل سے گزر رہی ہیں اور اس کی سطح کی تہہ یا قشر ارضی ٹھوس اور سرد ہے۔ یہ قشر یا سطحی تہہ بہت باریک اور پتلی ہے۔ اس کی موٹائی کا حساب میلوں یا زیادہ سے زیادہ دسیوں میلوں سے لگایا جاتا ہے۔ اس کا قطر ۷۵۰۰ میل سے قدرے زیادہ ہے اور اس کا قشر اوسطاً قطر کے سویں حصے کے برابر بھی نہیں۔ زمین کی اسی کھال یعنی قشر پر تمام ارضیاتی مظاہر وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ان مظاہر کی ابتدا ان تہوں، سلوٹوں یا خلاؤں (valls) سے ہوئی جنھوں نے پہاڑی سلسلوں کی شکل اختیار کی۔ اس کی تشکیل کو علمِ ارضیات میں 'جبال آفرینی' (orogenesis) کہتے ہیں۔ یہ قدرتی عمل خاصی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ایک ایسے 'ریلیف' کی نشوونما سے، جو بعد میں پہاڑ کی صورت اختیار کرنے والا تھا، قشر زمین اسی نسبت تناسب سے بہت نیچے دھنس گیا اور نیچے پائی جانے والی تہہ پر اس کی بنیاد یقینی ہو گئی۔

اس کرے کی سطح سمندر اور زمین میں جس طرح تقسیم ہوئی اس کی تاریخ کا تعین حال ہی میں کیا جا سکا ہے لیکن اب بھی یہ تاریخ بہت ادھوری ہے۔ اس کے تازہ ترین

[1] شائد اس لیے کہ عربوں کے تجارتی قافلے ادھر اکثر جاتے تھے اور وہ اس منظر سے بخوبی آشنا تھے۔ مترجم
[2] ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ [3] چین

اور سب سے زیادہ معلومہ ادوار کا بھی یہی حال ہے۔ اغلب ہے کہ تقریباً پانچ کھرب (نصف بلین) سال پہلے کرۂ ارض پر سمندر نمودار ہوئے اور کرۂ آب (Hydrosphere) وجود میں آیا۔ شائد ابتدائی دور کے خاتمے پر براعظم ایک تودۂ واحد کی شکل میں تھے۔ بعد میں الگ الگ ہو گئے۔ مزید براں بعض براعظم یا براعظموں کے حصے سمندروں میں تشکیل سے ظہور میں آئے۔ (مثلاً شمالی اوقیانوس کا براعظم اور یورپ کا کچھ حصہ)۔

جدید نظریات کی رُو سے زمین کی تشکیل کے سلسلے میں غالب اور نمایاں عنصر پہاڑی سلسلوں کی نشوونما اور ظہور تھا' ابتدائی دور سے چوتھی (Quartenary) دور تک زمین کے ارتقا کی درجہ بندی جبالیاتی منازل تغیر و ارتقا (Oragenic Share) کے مطابق کی جاتی ہے۔ خود "جبالیاتی منازل تغیر و ارتقا" کی گروہ بندی اسی نام سے 'ادوار' (cycles) کی صورت میں کی جاتی ہے۔ کیونکہ پہاڑوں کی تشکیل و ترتیب کے اثرات سمندر اور براعظموں کے باہمی توازن پر پڑے۔ چنانچہ زمین کے بعض حصے غائب ہو گئے اور بعض نئے حصے ابھر آئے۔ سینکڑوں کروڑوں سالوں سے سمندروں اور براعظموں کی سطح کی تقسیم اس سے تبدیل ہوتی آئی ہے۔ اس وقت موخر الذکر (براعظم) کرۂ ارض کی سطح کے ۳/۱ حصے پر محیط ہیں۔

اس طرح گزشتہ سینکڑوں، کروڑوں سالوں میں کرۂ ارض پر جو طبعی تغیرات واقع ہوئے ہیں، ان کا ایک بہت ہی سرسری سا خاکہ دیا جا سکتا ہے۔ زمین کے طبعی خدّ و خال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن صرف پہاڑوں کی تشکیل کا ذکر کرتا ہے۔ موجودہ نقطۂ نظر سے ان آیتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا جن میں زمین کی تخلیق و تشکیل کے حوالے سے خدا کی ربوبیت و رحمت کا اظہار کیا گیا ہے جیسا کہ حسبِ ذیل آیات میں:

سورۂ نوح (۷۱) آیات ۱۹-۲۰:

"اور خدا ہی نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنایا تاکہ اس کے بڑے بڑے

کشادہ رستوں میں چلو پھرو۔"

سورۃ الذّٰریٰت (۵۱) آیت ۴۸:

"اور زمین کو ہم ہی نے بنایا تو (دیکھو) ہم کیا خوب بچھانے والے ہیں۔"

یہ زمین کا قشر ہے جو فرش کے طور پر بچھایا گیا ہے۔ یہ ایک ٹھوس خول ہے جس پر ہم رہ سکتے ہیں کیونکہ کرۂ زمین کی اندرونی تہیں بہت گرم اور سیال ہیں اور کسی بھی قسم کی زندگی کے لیے ساز گار ہیں۔

پہاڑوں کے متعلق قرآن کے بیانات اور ان کی مضبوطی اور استحکام کے حوالے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

سورہ غاشیہ (۸۸) کی آیات ۱۹۔۲۰ میں کافروں کو بعض قدرتی مظاہر پر غور کرنے کی دعوت دی گئی مثلاً:۔

"اور یہ لوگ پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔"

مندرجہ ذیل آیتوں میں پہاڑوں کو زمین میں گاڑنے کی تفصل دی گئی ہے:

سورۃ ا (۷۸) آیات ۶۔۷

"کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو اس کی میخیں نہیں ٹھہرایا؟"

اس آیت میں 'اوتاد' (وتد کی جمع) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد وہ میخیں یا کھونٹے ہیں جو خیموں کو تاننے کے لیے زمین میں گاڑتے ہیں۔

جدید ماہرینِ ارضیات کے مطابق زمین کی تہیں یا شکنیں (ڈلماہ گو) پہاڑوں کے لیے بنیادیں مہیا کرتی ہیں اور ان کے ناپ (لمبائی، چوڑائی، موٹائی یا گہرائی) تقریباً ایک میل سے دس میل تک ہوتے ہیں۔ زمین کے قشر کا استحکام انہی تہوں یا شکنوں سے منتج ہوتا ہے۔

لہٰذا قرآن کی بعض عبارتوں میں پہاڑوں کے متعلق غور و فکر کا پایا جانا باعثِ تعجب نہیں۔ مثلاً

"اور اس پر پہاڑوں کو مضبوطی سے قائم کر دیا۔" (۷۹:۳۲)

(۷۹:۳۲)

"اللہ نے زمین میں پہاڑ ڈال دیئے تاکہ وہ تم کو لے کر ڈانواں ڈول نہ ہونے لگے۔" (۳۱:۱۰)

یہی جملہ سولھویں صورت (النحل) کی پندرھویں آئت میں دہرایا گیا ہے۔ اور یہی خیال کسی تبدیلی کے بغیر اکیسویں سورت (الانبیاء) کی اکتیسویں آئت میں دہرایا گیا ہے:

"اور ہم نے زمین میں مضبوط، سے پہاڑ قائم کر دیئے تاکہ وہ تم کو لے کر ڈانواں ڈول نہ ہونے لگے۔"

ان آیات میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ جس طریقے سے زمین پر پہاڑ بنائے گئے ہیں، وہ اس کے استحکام اور مضبوطی کا ضامن ہے۔ جدید ارضیاتی معلومات قرآن کے ان بیانات سے متفق ہیں۔

د۔ زمین کا کرۂ ہوائی

گزشتہ باب میں خاص طور پر آسمان کے متعلق جن قرآنی بیانات کا ہم نے جائزہ لیا ہے، ان کے علاوہ بھی قرآن میں متعدد ایسے بیانات ملتے ہیں جن کا تعلق کرۂ ہوائی میں رونما ہونے والے مظاہر سے ہے۔ جہاں تک ان بیانات اور جدید سائنسی معلومات کے باہمی مقابلے کا تعلق ہے، دونوں میں قطعاً کوئی تضاد یا اختلاف نہیں پایا جاتا۔

بلندی

جب آدمی بلند جگہوں، پہاڑوں وغیرہ پر چڑھتا ہے تو ایک قسم کی بیکلی کا احساس ہوتا ہے جسے اس تجربے سے گزرنے والے بھی جانتے ہیں۔ جیسے جیسے آدمی اوپر چڑھتا جاتا ہے، بیکلی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چھٹی سورت (انعام) کی آیت ۱۲۵ میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے:

"جس شخص کو اللہ سیدھے راستے پر ڈالنا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو وہ بے راہ رکھنا چاہتا ہے اس کے سینے کو تنگ بہت تنگ کر دیتا ہے جیسے کوئی آسمان میں چڑھتا ہو۔"

بعض مفسرین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے عرب اونچی جگہ پر چڑھنے سے طبیعت میں بےکلی پیدا ہونے کے تصور سے ناآشنا تھے۔ لیکن یہ دعویٰ بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ جزیرہ نمائے عرب میں دو میل سے بھی زیادہ اونچی پہاڑی چوٹیاں موجود تھیں۔ اس لیے یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ اونچی جگہوں پر چڑھنے سے سانس لینے میں جو تنگی اور تکلیف محسوس ہوتی ہے اس زمانے کے عرب اس سے ناآشنا ہوں[1]۔ دوسروں کو اس آیت میں خلا کی تسخیر کی پیشن گوئی نظر آتی ہے لیکن جہاں تک اس عبارت کا تعلق ہے، یہ خیال درست نہیں۔

کرۂ ہوائی میں بجلی

کرۂ ہوائی میں بجلی کی موجودگی اور اس کے نتائج و عواقب یعنی صاعقہ[2] (lightning) اور اولوں کا ذکر حسبِ ذیل آیات میں آیا ہے:

سورۃ الرعد (۱۳)، آیات ۱۲-۱۳

"اور وہی تو ہے جو تم کو ڈرانے اور امید دلانے کے لیے بجلی (برق) دکھاتا اور بھاری بھاری بادل پیدا کرتا ہے اور رعد اور فرشتے سب اس کے خوف سے اس کی تسبیح و حمد کرتے رہتے ہیں۔ اور وہی بجلیاں (صاعقہ) بھیجتا ہے۔ پھر جس پر

---

[1] یمن کا دارالحکومت صنعا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں آباد تھا جو سطحِ سمندر سے تقریباً ۷۰۰۰ فٹ اونچائی پر واقع ہے۔ مصنف

[2] بجلی کی تین نوعیتیں ہیں: ۱۔ برق:- چمکنے والی بجلی، ۲۔ رعد:- کڑکنے والی بجلی، ۳: صاعقہ: گرنے والی بجلی۔ مترجم

چاہتا ہے گرا بھی دیتا ہے۔ اور وہ خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور وہ بڑی قوت والا ہے۔"

سورۃ النور (۲۴)، آیت ۴۳ کا حوالہ پہلے ہی اس باب میں دیا جا چکا ہے:

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا ہی بادلوں کو چلاتا ہے اور پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے۔ پھر ان کو تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل (کر برس) رہا ہے۔ اور آسمان میں جو اولوں کے پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ہٹا رکھتا ہے، اور بادل میں جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر کے بینائی کو اچکے لیے جاتی ہے۔"

مندرجہ بالا دونوں آیتوں میں مینہ برسانے والے بھاری بادلوں یا اولے برسانے والے بادلوں کی تشکیل اور بجلی گرنے کے باہمی تعلق کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مینہ برسانے والے بادل کو اس کے متوقع فوائد کی وجہ سے امید اور طمع کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جب کہ اولوں اور بجلی کو خوف و دہشت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ یہ قادرِ مطلق کے حکم سے گرتے ہیں۔ کرۂ ہوائی کی بجلی کے متعلق جدید معلومات سے ان دونوں مظاہر کے باہمی تعلق کی تصدیق ہوتی ہے۔

سائے

سایوں اور ان کی حرکت کی توجیہ آج کل بڑے سیدھے سادے طریقے سے کی جاتی ہے۔ قرآن کی حسبِ ذیل آیات میں اسے موضوعِ بحث بنایا گیا ہے:

سورہ النحل (۱۶) آیت ۸۱:

"اور خدا ہی نے (تمہارے آرام کے لیے) اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے"

سورہ النحل (۱۶) آیت ۴۸

"کیا ان لوگوں نے خدا کی مخلوقات میں سے ایسی چیزیں نہیں دیکھیں جن کے

ساۓ دائیں سے (بائیں کو) اور بائیں سے (دائیں کو) لوٹتے رہتے ہیں (یعنی) خدا کے آگے عاجز ہو کر سجدے میں پڑے رہتے ہیں۔"

سورۂ فرقان (۲۵) آیات ۴۵ - ۴۶ :-

"بھلا تم نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کو نہیں دیکھا کہ وہ ساۓ کو کس طرح (دراز کر کے) پھیلا دیتا ہے۔ اور اگر وہ چاہتا تو اس کو (بے حرکت) ٹھہرا رکھتا پھر سورج کو اس کا رہنما بنا دیتا ہے۔ پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف لسٹ لیے

اس قرآنی عبارت میں ایسے ٹکڑے بھی ہیں جن میں خدا کی پیدا کردہ تمام چیزوں اور ان کے سایوں کا اس کے سامنے اظہار عجز و بندگی کرنے کا بیان ہے اور یہ کہ وہ جب اور جیسے چاہے اپنی قدرتِ کاملہ کے تمام ظہورات کو واپس لے سکتا ہے۔ ان باتوں سے ہٹ کر، بلکہ مزید براں، اس عبارت میں سورج اور سایوں کے باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یقین کیا جاتا تھا کہ ساۓ کی حرکت اور جہت کا دارومدار سورج کے مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرنے پر تھا۔ دھوپ گھڑی پر طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک وقت ناپنے کے لیے اسی اصول سے کام لیا جاتا تھا۔ اس مظہر کی جو توجیح نزولِ قرآن کے وقت مروج تھی، یہاں اس کا حوالہ دیۓ بغیر قرآن اس مظہر کا ذکر کرتا ہے کیونکہ اس توجیح کو اگرچہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد آنے والے بھی صدیوں تک قبول کرتے رہے لیکن آخر یہ غلط ثابت ہو جاتی۔ مزید براں قرآن سورج کے اس فرضِ منصبی کا ذکر کرتا ہے جو سایوں کے مظاہر پر راہ دکھانے والے کی حیثیت سے اس کا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ساۓ کے متعلق قرآن کے بیان اور جدید سائنسی معلومات میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں۔

۶

حیوانات اور نباتات کی دنیا

اس باب میں بہت سی ایسی آیات جمع کر دی گئی ہیں جن میں زندگی کے آغاز کا بیان ہے نیز نباتات کی دنیا کے بعض پہلوؤں اور حیوانات کی دنیا کے عام یا خصوصی حالات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ایسی آیات کو ایک جگہ اکٹھا کرنے سے ان تمام معلومات کا ایک عمومی جائزہ سامنے آ جاتا ہے جو ان موضوعات پر قرآن میں پائی جاتی ہیں۔

جہاں تک اس باب اور اس سے اگلے باب کے موضوع کا تعلق ہے، بعض دفعہ قرآنی عبارات کے تمام معائنے و تحقیق نے ہمیں نازک اور احتیاط طلب صورتِ حال سے دوچار کر دیا کیونکہ فرہنگ و الفاظ میں بعض خلقی و جبلی مشکلات پائی جاتی ہیں (اور ایک زبان کے خیالات، تصورات، محاورات، طرزِ ادا کو دوسری زبان میں ہو بہو منتقل کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ مترجم)۔ ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے موضوع سے متعلق سائنسی معلومات سے کام لیا گیا ہے۔ جانداروں — حیوانات، نباتات اور انسانوں کے معاملے میں ایسا خاص کر کیا گیا ہے جہاں ان موضوعات پر قرآن کے بعض بیانات کے مطلب و معنی کی تلاش میں سائنس کی تعلیمات سے آمنا سامنا ناگزیر معلوم ہوا۔ یہ بات واضح ہو جاۓ گی کہ ادیبوں[1] نے قرآن کی ان عبارتوں کے جو ترجمے کیے وہ سائنسدانوں کے نزدیک ہرگز صحیح نہیں۔ یہ بات ان تفسیروں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جن کے مصنف ایسے لوگ ہیں جو متنِ قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری سائنسی معلومات

[1] سائنس سے ناواقف علماۓ مذہب بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ مترجم

سے بے بہرہ ہیں۔

۱- زندگی کا آغاز

یہ سوال ہمیشہ انسان کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے خود اپنی وجہ سے بھی اور اپنے اردگرد پائے جانے والے جانداروں کی وجہ سے بھی۔ یہاں اس کا عمومی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے گا۔ انسان جن کے زمین پر ظہور اور عمل توالد و تناسل کے متعلق قرآن میں طویل انکشاف انگیز بیانات پائے جاتے ہیں' اس پر اگلے باب میں بحث کی جائے گی۔

جب قرآن زندگی کے آغاز کی موٹی موٹی باتیں بیان کرتا ہے تو ان میں بہت اختصار ہوتا ہے۔ ایک ایسی آیت جس میں کائنات کی تخلیق کے عمل کا ذکر ہے' اس میں زندگی کے آغاز کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اس کا حوالہ اور اس پر تبصرہ پہلے دیا جا چکا ہے:

سورۃ الانبیاء (۲۱) آیت ۳۰

"کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے جدا جدا کر دیا۔ اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔ پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔"

"کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے 'نکالنے' بنانے" کا تصور شکوک و شبہات کو جنم نہیں دیتا۔ اس جملے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر جاندار چیز پانی سے بنائی گئی (یعنی پانی اس کا جزو لاینفک ہے) یا یہ کہ ہر جاندار چیز کا آغاز پانی سے ہوا۔ یہ دونوں ممکنہ مطالب سائنسی معلومات کے عین مطابق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا اور پانی ہی تمام زندہ خلیوں کا جزو اعظم ہے۔ پانی کے بغیر زندگی ممکن نہیں اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب کسی دوسرے سیارے پر زندگی کے امکان پر بحث کی جاتی ہے تو ہمیشہ سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا اس سیارے پر کافی مقدار میں پانی موجود ہے جو زندگی کو برقرار رکھ سکے؟

جدید معلومات سے ہمیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قدیم ترین جاندار چیزیں از قسم نباتات

ہی رہی ہوں گی۔ بحری نباتات (algae) کی ایسی قسمیں ملی ہیں جن کا تعلق قبل کیمبری (Pre-Cambrian) دور سے ہے یعنی قدیم ترین معلومہ خشکی کے وقت سے۔ حیوانات (animal organisms) غالباً ان سے کچھ بعد میں نمودار ہوئے۔ وہ بھی سمندر ہی سے آئے۔

یہاں عربی لفظ 'ماء' کا ترجمہ 'پانی' کیا گیا ہے۔ اس کے معنی میں آسمان کے پانی اور سمندر کے پانی کے علاوہ ہر قسم کی مائعات بھی شامل ہیں۔ جب اس سے مراد آسمان سے برسنے والا پانی لیا جائے تو وہ ایک ایسا عنصر ہے جو ہر قسم کی نباتاتی زندگی کے لیے ضروری ہے۔

سورہ طٰہٰ (۲۰) آیت ۵۳:

"وہ (وہی تو ہے) جس نے پانی برسایا پھر اس سے ہم نے مختلف قسم کی نباتات کے جوڑے[1] پیدا کیے۔ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔"

دنیائے نباتات میں جوڑوں کے متعلق یہ پہلا اشارہ ہے۔ ہم بعد میں اس موضوع کی طرف لوٹیں گے۔

دوسرے معنی یعنی مائع محض کے لحاظ سے یہ لفظ (ماء) اپنی غیر معین اور غیر واضح

---

[1] اس آیت کا جو انگریزی ترجمہ مصنف نے استعمال کیا ہے اس میں Pairs of Plants (پودوں کے جوڑے) کے الفاظ ہیں۔ عبداللہ یوسف علی کے ترجمے میں بھی یہی الفاظ ہیں۔ پکھتال کے انگریزی ترجمے اور اردو تراجم میں جوڑے (Pair) کا لفظ نہیں ملتا۔ صرف مختلف قسم کی پیداوار یا انواع و اقسام کی روئیدگیوں کا ذکر ہے۔ جب کہ قرآن کے الفاظ ازواجاً من نبات شتّیٰ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے معنی انواع و اقسام کی نباتات کے جوڑے (ازواج) ہیں۔ لیکن اردو مترجمین کی توجہ 'اَزْوَاجاً' کی اہمیت اور اس کے ترجمے کی طرف نہیں گئی۔ حالانکہ قرآن نے ایک سائنسی طبعی نباتاتی حقیقت کا اظہار آج سے چودہ سو سال پہلے کیا۔ لیکن ہمارے محض ادیب اور عالم مترجمین خود اس سائنسی طبعی نباتاتی حقیقت سے ناآشنا تھے۔ مترجم

شکل میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ تخصیص کرنے کے لیے کہ ہر قسم کی حیوانی زندگی کی بنیاد کیا ہے:

سورۂ نور (۲۴) آیت ۴۵:-

"اور خدا ہی نے ہر چلنے پھرنے والے جانور کو پانی سے پیدا کیا۔"

آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ کیسے اس لفظ (ماء) کا اطلاق مادۂ منویہ پر بھی ہوتا ہے[1]۔

لہٰذا خواہ اس کا تعلق عمومی حیثیت سے زندگی کے ماخذ و منابع سے ہو یا ان عناصر سے جو مٹی سے پودوں کی پیدائش کا باعث ہوتے ہیں، یا تخم حیوانات سے، زندگی کے آغاز کے متعلق قرآن کے تمام بیانات جدید سائنسی معلومات کے عین مطابق ہیں قرآن کے نزول کے وقت زندگی کے ماخذ و منابع کے متعلق جو کثیر خرافات و توہمات مروج تھے، ان میں سے کسی کا ذکر قرآن میں نہیں ملتا۔

(ب) دنیائے نباتات

قرآن کی جن کثیر عبارتوں میں بارش کے مفید اثرات سے سبزہ و نباتات کے اگنے اور نشوونما پانے کے واسطے سے خدا کی ربوبیت و رحمت کا ذکر ہے، ہمارے لیے یہاں ان سب کا حوالہ دینا ممکن نہیں۔ یہاں صرف تین آیتوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

سورۂ نحل (۱۶) آیات ۱۰-۱۱

"وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جسے تم پیتے ہو اور اس سے درخت بھی (شاداب ہوتے) ہیں۔ جن میں تم اپنے چوپایوں کو چراتے ہو۔ اسی پانی سے وہ تمہارے لیے کھجور اور انگور اگاتا ہے اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے۔"

سورۂ انعام (۶) آیت ۱۰۰[2]

---

[1] تناسلی غدود (Reproductive glands) اس کا افراز کرتے ہیں اور اس میں کرم منی ہوتے ہیں (مصنف) انہی سے بچے کی تخلیق ہوتی ہے۔ مترجم

[2] اصل کتاب کے انگریزی ترجمے میں آیت کا نمبر غلطی سے ۹۹ شائع ہو گیا ہے۔ صحیح نمبر ۱۰۰ ہے۔ مترجم

"اور وہی تو ہے جو آسمان سے پانی برساتا ہے۔ پھر ہم ہی اس سے ہر طرح کی روئیدگی اگاتے ہیں۔ پھر اس سے سبز سبز کونپلیں نکالتے ہیں اور ان کونپلوں میں سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔ اور کھجور کے گابھے میں لٹکتے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں یہ چیزیں جب پھلتی ہیں تو ان کے پھلوں پر اور (جب پکتی ہیں تو ان کے پکنے پر نظر کرو۔ ان میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں (قدرتِ خدا کی بہت سی) نشانیاں ہیں۔"

سورۂ ق (۵۰) آیات ۹ تا ۱۱

"اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا اور اس سے باغ و بستان اگائے اور کھیتی کا اناج اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہہ بہ تہہ ہوتا ہے۔ یہ (سب کچھ) بندوں کو روزی دینے کے لیے کیا ہے اور اس پانی سے ہم نے شہر مردہ (یعنی افتادہ زمین) کو زندہ کیا۔ بس اسی طرح (قیامت کے روز قبروں سے) نکل پڑنا ہے۔"

ان معلومات حقائق پر قرآن بعض دوسری معلومات و حقائق کا اضافہ کرتا ہے جن کا تعلق نسبتاً زیادہ متخصصانہ مضامین سے ہے:-

دنیائے نباتات میں توازن

سورۂ الحجر (۱۵) آیت ۱۹:

"اور زمین کو بھی ہم ہی نے پھیلایا اور اس پر پہاڑ بنا کر رکھ دیئے اور اس میں ہر قسم کی چیز ایک معین و متوازن مقدار سے اگائی۔"

مختلف غذاؤں کی خصوصیات

سورۂ رعد (۱۳) آیت ۴:

"اور زمین میں کئی طرح کے قطعات ہیں، ایک دوسرے سے ملے ہوئے

اور انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت۔ جن میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ تنے سے اوپر جاکر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعض میں دو تنے نہیں ہوتے حالانکہ سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے۔ اور ہم بعض میووں کو بعض میں فضیلت دیتے ہیں اور اس میں سمجھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔"

ان آیات کی موجودگی دلچسپی کا موجب ہے کیونکہ ان سے استعمال کردہ الفاظ کی سنجیدگی اور متانت ظاہر ہوتی ہے اور ان میں ایسا کوئی بیان نہیں ملتا جو اس زمانے کے معتقدات کا حامل ہو اور بنیادی حقائق سے روگرداں ہو۔ خاص طور پر قابلِ توجہ قرآن کے وہ بیانات ہیں جو دنیائے نباتات میں توالد و تناسل یا باز آفرینی (Re production) سے متعلق ہیں۔

یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ نباتات میں توالد و تناسل یا باز آفرینی کے دو طریقے ہیں۔ ایک جنسی (Sexual) دوسرا بے جنسی (Unsexual)۔ حقیقت میں پہلے پر ہی توالد و تناسل یا باز آفرینی کے الفاظ کا اطلاق ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے ایک ایسے حیاتیاتی عمل کی تعیین ہوتی ہے جس کا مقصد ایک ایسے فرد کو ظہور میں لانا ہوتا ہے جو اپنے جنم دینے والے فرد سے مشابہ ہو۔

بے جنسی (unsexual) عمل توالد و تناسل محض تعداد بڑھانے کا عمل ہے یہ ایک جسم نامی کے ٹکڑوں میں بٹ جانے سے منتج ہوتا ہے۔ یہ جسم نامی اصل پودے سے جدا ہو کر اس طرح نمو پذیر ہوتا ہے کہ اصل پودے سے مشابہ ہو جاتا ہے۔ گلرماں (guilliermond) اور مینجنو (Mangenot) اسے "نشوونما اور بالیدگی کا ایک خاص معاملہ" خیال کرتے ہیں۔ اس کی ایک بہت سادہ مثال قلم ہے: یعنی کسی پودے کی قلم لے کر اسے مناسب طور پر آبپاشی کی موٹی مٹی میں لگانا اور نئی جڑیں اُگنے سے اس کا نئی زندگی پانا۔ بعض پودوں میں اس کام کے لیے خاص طور پر وضع کیے گئے عضوے (organs) ہوتے ہیں جب کہ دوسرے پودے ایسے جرثومے (Spores) چھوڑتے

ہیں جو بیج کا کام کرتے ہیں (یاد رہے کہ بیج جنسی تناسل (Sexual reproduction کے عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

نباتاتی دنیا میں جنسی تناسل کا عمل ایک ہی پودے پر اکٹھی ہوئی دو یا مختلف پودوں پر واقعی جنسی متشکلات (formations) کے نر اور مادہ حصوں کو باہم جوڑ دینے سے ظہور میں آتا ہے۔ قرآن میں صرف اسی ایک صورت کا ذکر کیا گیا ہے:

سورۂ طٰہٰ (۲۰) آیت ۵۳

"وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے ہم نے مختلف قسم کی نباتات کے جوڑے پیدا کیے جن میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔"

'جوڑے' میں کا ایک 'ترجمہ ہے 'زوج (جمع ازواج) کا جس کے اصل معنی ہیں "وہ جو دوسرے کے ساتھ مل کر جوڑا بنائے۔"

یہ لفظ ایک شادی شدہ جوڑے کے لیے بھی اسی طرح استعمال ہوتا ہے جیسے جوتوں کے جوڑے کے لیے۔

سورۂ حج (۲۲) آیت ۵

وتری الارض هامدة فاذا انزلنا عليها الماء اهتزت وربت
وانبتت من كل زوج بهيج ○

ترجمہ: (اسے دیکھنے والے) تو دیکھتا ہے کہ (ایک وقت میں) زمین خشک پڑی ہوئی ہے۔ پھر جب ہم مینہ برساتے ہیں تو وہ شاداب ہو جاتی ہے اور ابھرنے لگتی ہے اور طرح طرح کی خوشنما نباتات (جوڑوں کی صورت میں) اگاتی ہے۔"

سورہ لقمان (۳۱) آیت ۱۰

"(ہم نے) زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام کے (پودوں کے جوڑے) اگائے۔"[1]

---

[1] ان آیات کا ترجمہ کرتے وقت بھی ہمارے اردو مترجمین نے لفظ 'زوج' (جوڑے) کے ترجمے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مترجم

سورۂ رعد (۱۳)، آیت ۳ :-

"(اللہ نے) ہر طرح کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کیے۔"

ہم جانتے ہیں کہ اعلیٰ قسم کے پودے جن کی تنظیم نہایت پیچیدہ اور ترقی یافتہ ہوتی ہے، ان کے عمل تناسل و باز آفرینی (Reproduction Process) کا آخری مقصد اور بہترین پیداوار پھل ہوتا ہے۔ پھل کے مرحلے سے پہلے پھول آتے ہیں۔ پھول میں نر اور مادہ دونوں قسم کے عضوے (Organs) ہوتے ہیں۔ جنھیں بالترتیب حاملِ زر (Stamen) اور بیضک (Ovule) کہتے ہیں۔ جب بیضکوں تک زردانہ (Pollen) پہنچتا ہے تو وہ پھل دیتے ہیں۔ پھل پکنے پر بیج دیتا ہے۔ لہذا تمام پھلوں میں نر اور مادہ حصے یا عضوے موجود ہوتے ہیں۔ محولہ بالا آیت قرآن کا یہی مطلب ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ بعض قسم کے پھل ایسے پھولوں سے پیدا ہوتے ہیں جو بار آور نہیں کیے گئے ہوتے (Non-Fertilized) مثلاً کیلے، اناس کی بعض اقسام، انجیر، سنترہ، انگور کی بیل۔ تاہم وہ ایسے پودوں سے بھی پیدا ہو سکتے ہیں جو جنسی خصوصیات کے حامل ہوں۔

عمل تناسل و باز آفرینی اس وقت عروج پر پہنچ جاتا ہے جب بیج کا اوپر کا چھلکا کھل جاتا ہے اور اس میں سے اکھوا پھوٹتا ہے (بعض دفعہ یہ اکھوا گٹھلی میں ہوتا ہے) بیج کے کھلنے سے جڑیں نمودار ہوتی ہیں اور وہ سب کچھ زمین سے حاصل کرتی ہیں جو بیج کے طور پر پودے کی آہستہ رو زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ نشوونما پا کر ایک نیا پودا بن جائے۔

سورۂ انعام (۶) آیت ۹۵:

"بے شک خدا ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر (اُن سے درخت وغیرہ) اگاتا ہے۔"

قرآن دنیائے نباتات میں جوڑے (Pairs) کے ان اجزا کی موجودگی کا اکثر ذکر کرتا ہے اور کسی حد بندی کے بغیر نسبتاً عام تریاق و سباق میں جفت یا جوڑے (Couple) کا تصور ابھارتا ہے :-

سورہ یٰسٓ (۳۶)، آیت ۳۶:

"پاک ہے وہ خدا جس نے زمین کی نباتات کے اور خود ان (انسانوں) کے اور جن چیزوں کو ان کی خبر نہیں سب کے جوڑے بنائے۔"

محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں، جن چیزوں کی انسانوں کو خبر نہ تھی، ان کے متعلق بہت سے مفروضے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ آج ہم ان کی ساختوں (Structures) یا جڑواں تفاعل و فرض منصبی (Coupled Functions) کو چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی جاندار اور بے جان اشیا میں تقسیم اور متمیز کر سکتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ ایک دفعہ پھر نوٹ کر لیا جائے کہ یہ وضاحت سے بیان کردہ تصورات و خیالات کو جدید سائنس سے کامل مطابقت رکھتے ہیں۔

ج۔ حیوانات کی دنیا

حیوانات کی دنیا کے متعلق قرآن میں متعدد ایسے سوالات ہیں جو تبصرہ طلب ہیں اور جدید سائنسی علم سے ٹکر لیتے ہیں۔ لیکن یہاں اگر ہم نیچے دی جانے والی قرآنی آیات کو نظر انداز کر جائیں تو موضوع زیر بحث پر قرآنی فرمودات کا محض ادھورا تصور ہمارے سامنے آئے گا۔ ان آیات میں دنیائے حیوانات میں بعض عناصر کی تخلیق کا حال اس مقصد سے بیان کیا گیا ہے کہ انسان خدا کی ربوبیت و رحمت پر غور و فکر کرے۔ ان کا حوالہ ایک مثال کے طور پر دیا جا رہا ہے کہ قرآن کی رو سے تمام چیزوں کی تخلیق انسانی ضروریات سے ہم آہنگی اور مطابقت رکھتی ہے۔ ان آیات میں خاص کر دیہاتی ماحول

ؒ بقول سعدی کہ ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بغافل نخوری ا

بادل، ہوا، چاند، سورج سب مصروف کار ہیں تاکہ تجھ (انسان) کو روٹی میسر آئے اور تو اس (یادِ الٰہی سے) غافل ہو کر نہ کھائے۔ مترجم

میں رہنے والوں کا معاملہ بیان کیا گیا ہے کیونکہ اس سے مختلف نقطۂ نظر سے جانچنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں:۔

سورۂ النحل (۱۶)، آیات ۵ تا ۸:۔

"اور چوپایوں کو بھی اسی نے پیدا کیا۔ ان میں تمہارے جاڑے کا سامان بھی ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور ان میں سے کھاتے بھی ہو۔ اور جب شام کو انہیں (جنگل سے) لاتے ہو اور جب صبح کو چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت و شان ہے۔ اور (دور دراز) شہروں میں جہاں تم محنت شاقہ کے بغیر نہیں پہنچ سکتے، وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار نہایت شفقت والا اور مہربان ہے۔ اور اسی نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور (وہ تمہارے لیے) رونق و زینت بھی ہیں اور وہ تمہارے لیے اور چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جن کی تم کو خبر نہیں۔"

ان عمومی ملاحظات کے پہلو بہ پہلو قرآن بعض بے حد متنوع موضوعات پر بھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ مثلاً:

- حیوانوں کی دنیا میں توالد و تناسل۔
- حیوانوں کی برادریوں کی موجودگی کی طرف اشارے۔
- شہد کی مکھیوں، مکڑیوں اور پرندوں کے متعلق بیانات۔
- حیوانی دودھ کے اجزا کے سرچشمے کے متعلق اظہارات۔

۱- دنیائے حیوانات میں توالد و تناسل

اس موضوع پر سورۂ النجم (۵۳) کی آیات ۴۵ - ۴۶ میں بڑی مختصر بحث کی گئی ہے:

"اور یہ کہ وہی دونوں یعنی نر اور مادہ کے جوڑے کو نطفے سے بناتا ہے جب (رحم میں) ڈالا جاتا ہے۔"

"جوڑے" کا لفظ وہی ہے جو نباتات کے توالد و تناسل سے متعلق آیات میں

پہلے آچکا ہے۔ یہاں جنسوں کا ذکر آیا ہے۔ جس صحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ تولید کے لیے نطفے کی بہت تھوڑی مقدار درکار ہوتی ہے، وہ حقیقتاً حیرت انگیز ہے۔ خود "نطفے" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس ریمارک کی مناسبت پر اگلے باب میں تبصرہ کیا جائے گا۔

۲- جانوروں کی جماعتوں/برادریوں کی موجودگی کے متعلق اشارے

سورۂ انعام (۶)، آیت ۳۸

"اور زمین میں جو چلنے پھرنے والے جاندار (حیوان) یا دو پروں سے اڑنے والے پرندے ہیں، ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تم لوگوں کی طرح کی جماعتیں نہ ہوں۔ ہم نے کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں کسی چیز (کے لکھنے) میں کوتاہی نہیں کی۔ پھر سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کیے جائیں گے۔"

اس آیت میں متعدد نکات تبصرہ طلب ہیں۔

اول یہ کہ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ موت کے بعد جانوروں کو کیا پیش آتا ہے۔ بظاہر اس بارے میں اسلام کا کوئی اصولی عقیدہ نہیں۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عام تقدیر (Predestination) کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسے تقدیر مطلق تصور کیا جا سکتا ہے یا اضافی و اعتباری تقدیر یعنی ایسی ساختوں (Structures) اور عملی تنظیم (function organisation) تک محدود جو کرداری رولوں پر اثر انداز ہوں۔ مثلاً ایک جانور مختلف خارجی تحریکات کے زیر اثر کام کرتا ہے۔

بلاشیر (Blachère) کا بیان ہے کہ ایک قدیم مفسر مثلاً رازی کا خیال تھا کہ اس آیت میں صرف جبلی اعمال کی طرف اشارہ ہے جن سے جانور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ شیخ سی بوبکر حمزہ اپنی تفسیر میں اس 'جبلت' کا ذکر کرتے ہیں۔ "جو حکمتِ خداوندی کے مطابق تمام جانداروں کو گروہ بندی پر مجبور کرتی ہے اور اس طرح وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ گروہ/جماعت کا ہر فرد اس طرح کام کرے کہ اس کا کام پورے گروہ

کے لیے مفید ہو۔

حالیہ دہوں میں حیوانی رویے پر گہری تحقیقات کی گئی ہے اور حقیقی حیوانی گروہوں، برادریوں کے وجود کا پتہ چلا ہے۔ ایک حیوانی گروہ، برادری کے کام کا طویل عرصے تک جائزہ لیا گیا ہے جو گروہی تنظیم کو تسلیم کرنے پر منتج ہوا ہے لیکن اس قسم کی تنظیم میں جو نظم و ترکیب کارفرما ہوتی ہے، بعض انواع میں اس کا انکشاف حال ہی میں ہوا ہے۔ شہد کی مکھیوں کے رویے اور تنظیمی ساخت و ترکیب کا مطالعہ سب سے زیادہ کیا گیا ہے اور اس کے متعلق ہمیں سب سے زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ وان فرش (Von Frisch) نے اس پر بہت کام کیا ہے۔ اس شعبے میں تحقیقی کام کے سلسلے میں ۱۹۷۳ء کا نوبل پرائز وان فرش، لورنیز اور ٹمبرجن کو دیا گیا۔

۳۔ شہد کی مکھیوں، مکڑیوں اور پرندوں کے متعلق بیانات

جب اعصابی نظام کے متخصصین اس حیرت انگیز تنظیم کی نمایاں مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں جو حیوانی رویے کی رہنمائی کرتی اور اس کا رخ متعین کرتی ہے تو سب سے زیادہ حوالے شہد کی مکھیوں، مکڑیوں اور پرندوں (خاص کر موسموں کے مطابق نقل مکان کرنے والے پرندوں) کے دیئے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ تینوں گروہ انتہائی ارتقا یافتہ تنظیم کا نمونہ پیش کرتے ہیں[1]۔

یہ حقیقت کہ قرآن دنیائے حیوانات کے ان تین مثالی گروہوں کا ذکر کرتا ہے، وہ سائنسی نقطۂ نظر سے ان جانوروں کے خاص طور پر دلچسپ کردار کے عین مطابق ہے۔

۱؎ قرآن میں چیونٹیوں (نمل) کا ذکر بھی آیا ہے جن سے ان کی باقاعدہ گروہی تنظیم بھی آشکار ہوتی ہے لیکن فاضل مصنف عمداً یا سہواً اسے نظر انداز کر گئے حالانکہ النحل، عنکبوت کی طرح سورۂ النمل بھی موجود ہے اور حضرت سلیمانؑ کے لشکروں سے بچنے کے لیے چیونٹیوں کی منظم کوشش کا ذکر آیا ہے۔ مترجم

شہد کی مکھیاں

قرآن میں شہد کی مکھیوں پر سب سے طویل تبصرہ کیا گیا ہے:۔

سورۂ النحل (۱۶) آیات ۶۸۔۶۹:

"اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈالی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور (اونچی اونچی) چھتریوں میں جو لوگ بناتے ہیں گھر بنا۔ پھر ہر قسم کے پھلوں سے چوستی پھر اور اپنے پروردگار کے صاف رستوں پر چل[1]۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے[2]۔ بے شک سوچنے والوں کے لیے اس میں بھی نشانی ہے"۔

یہ جاننا مشکل ہے کہ خدا کی طرف سے شہد کی مکھی کو صاف رستوں پر چلنے کا حکم دینے کا صحیح مطلب کیا ہے؟ شہد کی مکھیوں کے طور طریقوں کا جو علم اب تک حاصل ہوا ہے، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ شہد کی مکھیوں کے طرز عمل کے پس پشت ایک حیرت انگیز اعصابی نظام کارفرما ہے۔ قرآن کی پیش کردہ تینوں حیوانی مثالوں (شہد کی مکھی، مکڑی اور پرندے) کی یہی کیفیت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ شہد کی مکھی کا رقص دراصل شہد کی دوسری مکھیوں کو پیغام پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے اس طرح وہ دوسری مکھیوں کو بتاتی ہے کہ رس چوسنے کے لیے پھول کس طرف

۱؎ مصنف نے جو انگریزی ترجمہ استعمال کیا ہے۔ اس میں کا ترجمہ (Fellow in the ways of your Lord in humilit) دیا ہے یعنی اپنے پروردگار کے رستوں پر عاجزی کے ساتھ چل جب کہ اکثر اردو مترجمین اور پکھتال نے اس کا ترجمہ اللہ کے آسان یا صاف رستے کیا ہے جو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مترجم

۲؎ قرآن میں صرف یہی ایک آیت ہے جس میں انسان کے لیے دوا و شفا کا ذکر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہد بعض بیماریوں کے لیے مفید ہے۔ قرآن میں اور کہیں فن علاج کا ذکر نہیں آیا۔ مصنف

اور کتنے فاصلے پر ملیں گے۔ اس سلسلے میں وان فرش نے جو تجربہ کیا تھا وہ مشہور و معروف ہے اس سے شہد کی مکھی کی نقل و حرکت کا مطلب واضح ہوتا ہے کہ دراصل اس کا مقصد دوسری کارکن مکھیوں تک معلومات پہنچانا ہے۔

مکڑی

قرآن میں مکڑیوں کا ذکر ان کے گھر کے بودے پن پر زور دینے کے سلسلے میں کیا گیا ہے کیونکہ مکڑی کا گھر سب سے کمزور اور بے حیثیت ہوتا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق مکڑی کا گھر ایسا ہی ناپائیدار اور ناقابلِ اعتماد ہوتا ہے جیسا کہ ان لوگوں کے گھر جو خدا کے سوا کسی دوسرے کو اپنا مالک و مولا بنا لیتے ہیں۔

سورۂ عنکبوت (۲۹) آیت ۴۱:-

"جن لوگوں نے خدا کے سوا اوروں کو کارساز بنا رکھا ہے ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک طرح کا گھر بناتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ تمام گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہے۔ کاش یہ اس بات کو جانتے۔"

بے شک مکڑی کا جالا ان انتہائی نرم اور مہین تاروں سے بنا ہوتا ہے جو مکڑی کے غدور سے خارج ہوتے ہیں۔ انسان مکڑی کے جالے کی نزاکت اور کمزوری کی نقل کرنے سے قاصر ہے۔ اس جانور کے اعصابی خلیے جالے کا جو غیر معمولی تانا بانا بنتے ہیں وہ جیومیٹری کے نقطۂ نگاہ سے مکمل اور بے عیب ہوتا ہے۔

پرندے

پرندوں کا حوالہ قرآن میں بار بار آیا ہے۔ ان کا ذکر ابراہیمؑ، یوسفؑ، داودؑ، سلیمانؑ اور عیسیٰؑ کی زندگیوں کے واقعات میں آتا ہے۔ لیکن موضوع زیرِ بحث سے ان حوالوں کا کوئی تعلق نہیں۔

جس آیت میں زمین پر حیوانوں کی جماعتوں اور آسمان میں پرندوں کی جماعتوں کی

موجودگی کا ذکر ہے، اس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے، وہ سورۂ انعام (۶) کی حسبِ ذیل اڑتیسویں آیت ہے:

"اور زمین پر جو چلنے پھرنے والے جاندار (حیوان) یا دو پروں سے اڑنے والے پرندے ہیں، ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تم لوگوں کی طرح جماعتیں نہ ہوں۔ ہم نے کتاب (لوحِ محفوظ) میں کسی چیز (کے لکھنے) میں کوتاہی نہیں کی۔ پھر سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کیے جائیں گے۔"

دو دوسری آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ پرندے خدا کے مطیع و منقاد ہیں

سورۂ نحل (۱۶) آیت ۷۹۔

"کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی ہوا میں گھرے ہوئے اڑتے رہتے ہیں۔ ان کو خدا ہی تھامے رکھتا ہے۔"

سورۂ (۶۷) آیت ۱۹:-

"کیا انھوں نے اپنے سروں پر اڑتے ہوئے پرندوں کو نہیں دیکھا جو پروں کو پھیلائے رہتے ہیں اور ان کو سکیڑ بھی لیتے ہیں۔ مہربان خدا کے سوا انھیں کوئی تھام نہیں سکتا۔"

ان آیات میں ایک لفظ واحد کا ترجمہ بہت نازک معاملہ ہے۔ یہاں جو ترجمہ دیا گیا ہے اس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ خدا ہی اپنی قدرتِ کاملہ سے پرندوں کو ہوا میں تھامے رکھتا ہے۔ متعلقہ عربی لفظ 'امسک' ہے جس کے بنیادی معنی ہیں 'ہاتھ ڈالنا'، 'پکڑنا'، 'تھامنا'، 'کسی کو روک رکھنا'۔

ان آیات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ پرندوں کے رویے کا انحصار حکم و نظمِ خداوندی پر ہے جب کہ جدید سائنسی معلومات کے مطابق پرندوں کی بعض قسمیں اپنی نقل و حرکت کا پروگرام بنانے میں بے عیب مہارت رکھتی ہیں۔ ان آیات اور جدید معلومات کا باہمی مقابلہ و موازنہ خیال افروز اور دانش اندوز ہوگا۔ پرندوں کے گویا توالد و تناسل کے کوڈ میں نقل مکانی کا پروگرام شامل ہوتا ہے۔ بہت چھوٹے اور کم عمر پرندے جو بے حد

طویل اور پیچیدہ سفر بغیر کسی سابقہ تجربے اور رہنما کے کر لیتے ہیں' اس کی وجہ یہی پیدائش یا فطری حسن نقل مکانی ہوتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ جہاں سے نقل مکانی کر کے دوسری جگہ جاتے ہیں' ایک مقررہ تاریخ کو وہیں لوٹ آنے کی بھی فطری صلاحیت رکھتے ہیں پروفیسر ہمبر گر اپنی تصنیف "طاقت اور کمزوری"[1] میں مثال کے طور پر بحرالکاہل کے رہنے والے 'مٹن برڈ' (Mutton-bird) پرندے کا ذکر کرتا ہے جو ساڑھے پندرہ ہزار میل سے زائد سفر آٹھ (۸) کے ہندسے کی شکل میں کرتا ہے[2]۔ (یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس قسم کے سفر کے لیے بے حد پیچیدہ ہدایات پرندے کے اعصابی خلیوں میں رکھ دی گئی ہوں گی یقیناً ان کا ایک پروگرام بنایا گیا ہوگا۔ لیکن یہ پروگرام بنانے والا کون ہے ؟

۴۔ حیوانوں کے دودھ کا سرچشمہ

قرآن میں اس کی تعریف وتعیین کی گئی ہے جو بالکل جدید معلومات سے مطابقت رکھتی ہے (۱۶:۶۶)۔ یہاں اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر خود میں نے کیے ہیں کیونکہ جدید تراجم میں بھی اس کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے وہ میرے نزدیک قابلِ قبول نہیں یہ مثالیں دیکھیے :

آر۔ بلاشیری کا ترجمہ :

"Verby, in your cattle there is a lesson for you! We give you a pure milk to drink, excellent for its drinkers; (it - cans) from what in their , is between digested food and blood."

---

[1] انگلش: Power and fragility

[2] فرانسیسی: La Piussance et la fragilite

[3] یہ پرندہ یہ سفر چھ مہینے میں کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی تاخیر سے اس مقام پر واپس آجاتا ہے جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔ مصنف۔

پروفیسر حمید اللہ کا ترجمہ :

"Verily, there is food for thought in your cattle. From what is in their bellis among their excrement and blood, we make you drink pure milk, easy for drunkers to imbibe."

آر۔ بلاشیری کے ترجمے کا اردو ترجمہ :

"بے شک' تمہارے مویشیوں میں تمہارے لیے ایک سبق ہے۔ ان سے ہم تمہیں پینے کے لیے خالص دودھ عطا کرتے ہیں جو پینے والوں کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔ یہ دودھ ان مویشیوں کے پیٹوں سے ہضم شدہ چارے اور خون کے درمیان سے آتا ہے۔"

پروفیسر حمید اللہ کے ترجمے کا اردو ترجمہ :۔

"بے شک تمہارے مویشیوں میں تمہارے لیے غور وفکر کا مقام ہے کہ ان کے پیٹوں میں جو گوبر اور لہو ہے اس سے ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جسے پینے والے آسانی سے پیتے ہیں۔"[1]

اگر بلاشیری اور حمید اللہ کے ترجمے کسی ماہر عضویات (Physiologist) کو دکھائے

---

[1] محمد مارماڈیوک پکھتال کا انگریزی ترجمہ بھی پروفیسر حمید اللہ کے ترجمے سے تقریباً ملتا جلتا ہے۔ اردو مترجمین کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں مثال کے طور پر ہم مولوی فتح محمد جالندھری کا ترجمہ نقل کرتے ہیں:

"اور تمہارے لیے چارپایوں میں بھی (مقام) عبرت (وغور) ہے کہ ان کے پیٹوں میں جو گوبر اور لہو ہے اس سے ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والے کے لیے خوشگوار ہے۔"

فاضل مصنف کی یہ بات کافی حد تک درست ہے کہ قرآن کے سائنسی موضوعات سے متعلق معاملات کا صحیح ترجمہ ادیبوں اور مذہبی عالموں کے بس کی بات نہیں تاوقتیکہ وہ جدید سائنسی پس منظر اور معلومات سے پوری طرح آگاہ نہ ہوں۔ مترجم

مائیں تو وہ انھیں بے حد مبہم قرار دے گا کیونکہ ان میں اور جدید تصورات میں ابتدائی سطح پر بھی کوئی مطابقت اور ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ یہ ترجمے ممتاز عربی دانوں نے کیے ہیں۔ لیکن یہ ایک جانا پہچانا امرِ واقعہ ہے کہ ایک ماہر مترجم بھی سائنسی بیانات کے ترجمے میں غلطی کر سکتا ہے تاوقتیکہ وہ اس خاص شعبۂ سائنس میں تخصیص کا درجہ نہ رکھتا ہو۔ میرے نزدیک مذکورہ آیت (۱۶ : ۶۶) کا۔ صحیح ترین ترجمہ یہ ہوگا:

"Verily, in cattle there is a lesson for you. We give you to drink of what is inside their bodies, coming from a conjuction between the contents of the intestine and the blood, a milk pure and pleasant for those who drink it."

اردو ترجمہ:۔ بے شک مویشیوں میں تمھارے لیے ایک سبق ہے۔ ہم تمھیں پینے کو دیتے ہیں جو ان کے جسموں کے اندر ہوتا ہے جو ان کی آنتوں کے مافیہ اور خون کے میل سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہوتا ہے۔"

یہ ترجمانی اس مفہوم کے بہت قریب ہے جو قاہرہ کی امورِ اسلامی کی مجلس اعلیٰ کے مدوّنہ "منتخب" (۱۹۷۳ء) میں دیا گیا ہے اور جس میں جدید علم عضویات کا سہارا لیا گیا ہے۔

استعمال کردہ الفاظ کے لحاظ سے مجوزہ ترجمے کا جواز حسبِ ذیل ہے:

آر بلاشیری اور پروفیسر حمید اللہ نے جن عربی الفاظ (فِی بُطُونِهٖ) کا ترجمہ "ان کے پیٹوں کے اندر" کیا ہے۔ میں نے ان کا ترجمہ "ان کے جسموں کے اندر" کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ لفظ 'بطن' کے معنی 'درمیان' یا 'کسی چیز کا اندرونی حصہ" بھی ہوتے ہیں اور 'پیٹ' بھی۔ یہاں اس لفظ کے معنی تشریح الاعضا کے عین مطابق نہ ہوں گے۔ ترجمہ "جسموں کے اندر" (Inside their bodies) متنِ عبارت سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔

دودھ کے اجزا کے 'ابتدائی سرچشمے' کا تصور لفظ 'مِن' (انگریزی 'from' اردو 'سے') سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اور 'میل یا اجتماع' کا تصور لفظ 'بَیْنِ' سے۔ موخر الذکر لفظ

کے معنی انگریزی میں صرف 'among' (درمیان، مجمع میں متن جملہ) ہی نہیں ہوتے بلکہ 'Between' (بیچ میں' دو چیزوں کے درمیان) بھی ہوتے ہیں جیسا کہ دوسرے محولہ ترجموں سے ظاہر ہے۔ تاہم یہ لفظ دو چیزوں یا دو آدمیوں کو باہم ملا دینے یا اکٹھا کرنے کا تصور ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

سائنسی نقطہ نظر سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مطلب سمجھنے کے لیے عضویاتی تصورات سے مدد لی جائے۔

وہ مادے (Substances) جو جسم کے لیے عام تغذیہ کا باعث ہوتے ہیں' ان کیمیائی تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں جو نظامِ ہضم کے خطے (Digestive tract) کے طویل رخ کے ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ یہ مادے آنت کے مافیہ (contents) سے پیدا ہوتے ہیں۔ کیمیائی تغیر کے مناسب مرحلے پر آنت میں پہنچ کر وہ اس کی دیوار میں سے گزر کر ایک باقاعدہ' یا نظام دورانِ خون کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ گزر یا نقل مقام دو طریقوں سے ہوتا ہے: یا تو بلاواسطہ طفی نالیوں (Lymphatic vessels) کے ذریعے' یا بالواسطہ طور پر یعنی جب خون دل کی طرف جاتا ہے تو عروقِ شعریہ کے ذریعے وریدوں سے اسے ایک عضو سے دوسرے عضو میں منتقل کر سکے۔[1] اس طرح یہ مادے پہلے جگر میں جاتے ہیں جہاں ان میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور پھر وہاں سے نکل کر وہ باقاعدہ دورانِ خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یوں ہر چیز جوئے خون (blood stream) سے ہو کر گزرتی ہے۔

دودھ کے اجزا کی اخراز (Secretion) غدودِ پستان سے ہوتی ہے۔ جوئے خون کے ذریعے جو ہضم شدہ غذا ان تک پہنچتی ہے۔ اس سے انھیں قوت ملتی ہے۔ اس لیے غذا سے جو کچھ اخذ کیا جاتا ہے خون اسے جمع کرنے اور جسم کے دوسرے حصوں تک پہنچانے کا کردار ادا کرتا ہے اور دوسرے اعضا کی طرح غدودِ پستان کو بھی تغذیہ فراہم کرتا ہے

---

[1] اس دوسرے طریقے کو انگریزی اصطلاح میں Portal circulation کہتے ہیں۔ جس کا اردو ترجمہ 'بابی دوران' ہو سکتا ہے۔ مترجم

اور غدودِ پستان دودھ پیدا کرتے ہیں۔

یہاں بنیادی عمل جو تمام دوسری چیزوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ آنت کے مافیہ اور خون کو آنت کی دیوار کی سطح پر باہم ملانا یا اکٹھا کرنا ہے۔ یہ بہت ہی واضح تصور ہے جو ان انکشافات کا نتیجہ ہے جو کیمیا اور نظامِ ہضم کے اعمال و افعال (Physiology) کے بارے میں کیے گئے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اس بارے میں قطعاً کچھ معلوم نہ تھا اور صرف حال ہی میں اس کا علم ہوا ہے۔ دورانِ خون کا انکشاف ہاروے نے نزولِ قرآن کے تقریباً ایک ہزار سال بعد کیا۔

چونکہ یہ تصورات و نظریات بہت بعد میں وضع کئے گئے لہٰذا میری رائے میں قرآن میں ان تصورات کی حامل آیت کی موجودگی کی کوئی انسانی توجیہ ممکن نہیں۔

۷

انسانی توالد و تناسل

قدیم انسانی تحریروں میں جب انسانی توالد و تناسل کے متعلق تفصیلات (خواہ وہ کیسی ہی قلیل و ناکافی کیوں نہ ہوں) دی جانے لگیں تو ناگزیر طور پر ان میں غلط بیانات کو جگہ ملی ازمنۂ وسطیٰ میں، بلکہ نسبتاً قریب تر زمانوں میں بھی، توالد و تناسل کے بارے میں توہمات و خرافات پائے جاتے تھے۔ اس کے برعکس ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ توالد و تناسل کے پیچیدہ نظام کو سمجھنے کے لیے تشریح الابدان کا علم ضروری تھا اور خوردبین کی ایجاد بھی۔ اور بنیادی سائنسی علوم، جنھوں نے آگے چل کر عضویات (Physiology)، جنینیات (Embryology) اور قابلہ گری (Obstetrics) وغیرہ کو جنم دیا، ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئے تھے۔

لیکن قرآن میں صورتِ حال مختلف نظر آتی ہے۔ اس میں متعدد مقامات پر نظامِ توالد و تناسل اور اس کے مختلف مراحل کو بڑی وضاحت اور صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور کسی ایک بیان میں بھی غلطی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ ہر چیز بڑے سادہ و آسان الفاظ میں بیان کی گئی ہے جنھیں آدمی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بعد میں انسان نے جو انکشافات کیے ان میں اور قرآنی بیانات میں ذرا سا بھی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

انسانی توالد و تناسل کا ذکر قرآن کی درجنوں آیات میں مختلف سیاق و سباق میں آیا ہے۔ اس کی وضاحت ان بیانات میں کی گئی ہے جو کسی ایک یا ایک سے زیادہ خصوصی نکات سے متعلق ہیں۔ ان متعلقہ آیات کا مجموعی حیثیت سے ایک عمومی تصور پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں ایک جگہ جمع کیا جائے۔ اس طرح ان کی تشریح و تفسیر نسبتاً آسان ہو جاتی ہے۔

بعض بنیادی تصورات کی یاد دہانی

بعض بنیادی تصورات جو نزولِ قرآن کے وقت اور بعد کی صدیوں میں لوگوں کو معلوم نہ تھے، یہاں ان کو ذہن میں لانا بہت ضروری ہے۔

انسانی توالد و تناسل ایک سلسلۂ مرورات (Series of Processes) کا نتیجہ ہوتا ہوتا ہے جو ہم میں اور دوسرے تھن دار جانوروں میں مشترک ہے۔ اس کا آغاز ایک ایسے بیضہ (ovule) کی باروری (fertilization) سے ہوتا ہے جو اپنے آپ کو بیضہ دان (ovary) سے الگ کر لیتا ہے۔ اس کا وقوع قنات فلوپی (Fallopian tube) میں طمثی دور (menstrual cycle) کے وسط میں ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ مرد کا مادۂ منویہ ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مرد کا کرم منی (spermatozoon) عورت کے بیضے کو بارود کرتا ہے۔ اس میں سے بھی صرف ایک بارود کرنے والے خلیے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا باروری کو یقینی بنانے کے لیے مرد کے نطفے کی انتہائی قلیل مقدار درکار ہوتی ہے جس میں بیک وقت لاکھوں کروڑوں کرم منی موجود ہوتے ہیں۔ یہ مادۂ منویہ خصیے پیدا کرتے ہیں اور یہ عارضی طور پر ایسے خزانوں اور نالیوں میں جمع ہوتا ہے جو بالآخر نظامِ پیشاب کے دائرے کی طرف جاتی ہیں۔ نظامِ پیشاب کے دائرے کے ساتھ ساتھ دوسرے غدود واقع ہوئے ہیں جو منی میں اپنی رطوبات بھی شامل کر دیتے ہیں۔

اس طرح جب نسوانی بیضہ مرد کے تخمِ منی سے سیراب و بارود ہو جاتا ہے تو عورت کے تولیدی نظام میں ایک مخصوص جگہ پر ٹھہرتا ہے۔ پھر وہ قناتِ فلوپی کے راستے رحم میں اترتا ہے اور وہاں قرار پکڑتا ہے اور جب ایک دفعہ آنول نالی (Placenta) متشکل ہو جاتی ہے تو اس کی مدد سے غشائے مخاطی (Mucosa) اور عضلے کی تہہ میں داخل ہو کر جلدی سے لفظاً و معناً وہاں جم جاتا ہے۔ اگر بارود بیضہ رحم کی بجائے قنات فلوپی میں جاگزیں ہو جائے تو حمل گر جائے گا۔

جب جنین ننگی آنکھ سے نظر آنے لگے تو یہ ایک چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا معلوم ہوتا ہے

جس کے مرکز میں پہلے تو انسانی صورت ناقابلِ شناخت ہوتی ہے۔ وہاں یہ تدریجی مرحلوں میں نشو و نما پاتی ہے۔ اب یہ مرحلے خوب جانے پہچانے ہیں۔ ان مراحل میں ہڈیاں، عضلات، اعصابی نظام، دورانِ خون اور آنتیں وغیرہ تشکیل پاتے ہیں۔

ان جدید اور مسلمہ تصورات کی روشنی میں ہم قرآنی بیانات کا تقابلی جائزہ لیں گے۔

قرآن کی رو سے انسانی توالد و تناسل

اس موضوع پر قرآن کے مسولات کا ایک ذہنی خاکہ تیار کرنا آسان نہیں۔ پہلی مشکل، جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق بیانات سارے قرآن میں منتشر اور پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ کوئی بڑی مشکل نہیں۔ اس کا زیادہ امکان ہے کہ ایک تجسس قاری کے لیے ذخیرۂ الفاظ کا مسئلہ گمراہ کن ثابت ہو۔ اس کی طرف گزشتہ ابواب میں بھی اشارے کیے جا چکے ہیں[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ آج بھی بہت سے ترجمے اور تفسیریں متداول ہیں جنہیں پڑھ کر ایک سائنسدان کو اس موضوع پر قرآنی تنزیلات کا سراسر غلط تصور و تاثر ملتا ہے۔ مثلاً اکثر تراجم میں انسان کی تشکیل 'خون کی پھٹکی' دلمہ (Clot of blood) یا لیسدار مادے (adhesion) سے بتائی گئی ہے۔ اس موضوع کے متخصص سائنسدانوں کے لیے یہ بیان ہرگز قابلِ تسلیم نہیں۔ رحمِ مادر میں بیضے کے ڈالے جانے اور قرار پکڑنے کے متعلق جو عبارت ہم لکھیں گے اس میں ہم ان وجوہات کا ذکر کریں گے جن کی بنا پر سائنسی پس منظر سے محروم ممتاز عربی دانوں نے ایسی فاش غلطیاں کیں۔ مطلب یہ ہے کہ توالد و تناسل کے بارے میں قرآنی بیانات کو صحیح طور

---

[1] اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے ؎

غلط فہمی بہت ہے عالمِ الفاظ میں اکبر ہزاروں مشکلوں کے بعد اکثر کام چلتا ہے

دراصل ایک زبان کے الفاظ کے معنی کے مختلف پہلوؤں کو دوسری زبان کے الفاظ میں جوں کا توں ادا کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ ہر زبان اپنے ماحول، معاشرے، تہذیب و تمدن، علوم و فنون کی روشنی میں ایک مخصوص مزاج کی حامل ہوتی ہے۔ مترجم

پر سمجھنے کے لیے عربی زبان کے علم کے ساتھ جدید سائنسی معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے۔

قرآن اپنے بیان کا آغاز ان تبدیلیوں پر زور دے کر کرتا ہے جو رحم مادر میں قرار پکڑنے سے پہلے جنین پر یکے بعد دیگرے واقع ہوتی ہیں۔

سورۂ الانفطار (۸۲) آیت ۶ - ۸:

"اے انسان! تجھ کو تیرے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈالا؟ (وہی تو ہے) جس نے تجھے پیدا کیا اور تیرے اعضا کو درست کیا پھر تجھ کو مناسب اعتدال پر بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔"

سورۂ (۷۱) آیت ۱۴:

"اللہ نے تم کو (مختلف) مراحل میں پیدا کیا۔"

اس بہت ہی عام اظہار خیال کے علاوہ قرآن توالد و تناسل کے بارے میں متعدد نکات کی طرف توجہ دلاتا ہے جو حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ استقرار حمل کے لیے نطفے کی بہت ہی قلیل مقدار درکار ہوتی ہے۔

۲۔ نطفے کے اجزائے ترکیبی۔

۳۔ نطفے سے بارود ہونے والے بیضہ کا رحم میں قرار پکڑنا۔

۴۔ جنین کا ارتقا۔

اب ہم ان نکات پر ایک ایک کر کے بحث کرتے ہیں:

یہ تصور قرآن کے حسب ذیل بیان میں گیارہ دفعہ دہرایا گیا ہے:

سورۂ النحل (۱۶) آیت ۴:

"اسی نے انسان کو منی کی قلیل مقدار سے بنایا۔"

یہاں عربی لفظ 'نطفہ' کا ترجمہ 'منی کی قلیل مقدار' (Small quantity of sperm) کیا گیا ہے کیونکہ اس کا بالکل صحیح اور مناسب ترجمہ کرنے کے لیے

ہمارے پاس الفاظ نہیں[1]۔ یہ لفظ ایک ایسے فعل سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں 'قطرہ قطرہ ہو کر گرنا' 'بہنا' 'ٹپکنا' 'رسنا'۔ جب بالٹی پانی یا دوسری سیال شے سے خالی کر لی جائے تو اس کی تہہ میں جو کچھ رہ جائے، اسے بیان کرنے کے لیے یہ فعل استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے مراد مائع کی بہت ہی قلیل مقدار ہوتی ہے۔ یہاں اس (نطفہ) سے مراد منی ہے کیونکہ یہ لفظ ایک دوسری آیت میں لفظ منی کے ساتھ آیا ہے۔

سورۂ القیٰمۃ (۷۵) آیت ۳۷

الم یك نطفة من منی یمنی

ترجمہ: کیا انسان منی کی قلیل مقدار نہ تھا جو رحم میں ٹپکائی گئی؟

یہاں 'نطفہ من منی' سے مراد منی کی قلیل مقدار یا قطرۂ منی ہے۔ ایک دوسری آیت سے متبادر ہوتا ہے کہ منی کی یہ قلیل مقدار یا نطفہ ایک 'قرار مکین' ۔ مضبوط و محفوظ مکان۔ میں رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اعضائے توالد و تناسل ہیں

سورۂ مومنون (۲۳) آیت ۱۳

ثم جعلنه نطفة فی قرار مکین۔

ترجمہ: پھر ہم نے اس کو ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔

آیت کے متن میں 'قرار مکین' کے الفاظ آئے ہیں جن کا انگریزی ترجمہ (firmly established lodging) کیا گیا ہے (اردو: محفوظ اور مضبوط جگہ) لیکن میرے (مصنف کے) خیال میں ان کا ہو بہو ترجمہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ان میں ایک ایسی جگہ کا تصور پیش کیا گیا ہے جو مضبوط بھی ہے، محفوظ بھی اور معزز بھی جو کچھ بھی ہو، یہاں ایک ایسا مقام مراد ہے جہاں انسان جسم مادر میں نشوونما پاتا ہے، اہم بات یہ تصور ہے کہ باروری یا استقرار حمل کے لیے منی کی بہت ہی قلیل مقدار درکار ہوتی ہے۔ اور یہ تصور زمانہ حاضر کی جدید ترین

---

[1] اردو میں لفظ 'نطفہ' جوں کا توں لے لیا گیا ہے جو تحریر کے علاوہ تقریر میں بھی زبان زد عام ہے۔ مترجم

سائنسی معلومات کے عین مطابق ہے۔

۲۔ نطفہ منی کے اجزائے ترکیبی

بارور کرنے والے سیال مادے (نطفۂ منی) کا ذکر قرآن میں جن الفاظ میں کیا گیا ہے ان کا جائزہ لینا باعث دلچسپی ہوگا۔

(ا) 'منی'۔ سورۂ قیامہ (۷۵) کی آیت ۳ میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

مَاءٍ دَافِقٍ ۔۔ (اچھلنے اور کثرت سے خارج ہونے والا پانی)

خلق من ماء دافق (۸۶ : ۶)

ترجمہ :۔ انسان اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔

(ج) ماء مهين ۔ حقیر پانی ثم جعل نسله من سللة من ماء مهين

ترجمہ: پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصے سے پیدا کی۔ (۳۲ : ۸)

الم نخلقكم من ماء مهين (۷۷ : ۲۰)

ترجمہ: کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟

ان دونوں آیات میں نطفے کو 'ماءِ مہین' یعنی حقیر پانی کہا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'مہین' یا حقیر اس کی نوعیت کی بنا پر نہیں کہا گیا بلکہ اس لیے کہ یہ پیشاب کی نالی کے راستے خارج ہوتا ہے۔

(د) 'نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ' ۔۔ مرکب یا مخلوق سیال :۔

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج ۔

ترجمہ :۔ بے شک ہم نے انسان کو مرکب سیالات سے پیدا کیا۔

پروفیسر حمیداللہ کی طرح بہت سے دوسرے مفسرین ان سیالات کو مرد اور عورت کے نطفے خیال کرتے ہیں۔ تاہم مفسرین کا بھی یہی خیال تھا کیونکہ وہ باروری یعنی استقرارِ حمل کے متعلق اعضا کے افعال و اعمال کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے۔ خاص کر عورت کے حیاتیاتی کوائف و حالات کا انہیں کوئی علم نہ تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ 'امشاج' سے مراد

مرد اور عورت کے نطفوں کا باہم متحد ہو جانا ہے

لیکن قاہرہ کی امورِ اسلامی کی مجلس اعلیٰ کے مدون کردہ "منتخب" کے حاشیہ نویس کی طرح کے جدید مصنفین نے اس نقطۂ نظر کی تصحیح کی ہے اور نوٹ کیا ہے کہ 'نطفہ' مختلف اجزا سے مرکب ہوتا ہے۔ "منتخب" کا حاشیہ نویس اس کی تفصیل نہیں دیتا لیکن میرے خیال میں اس کی یہ رائے بڑی معاملہ فہمی پر مبنی ہے۔

منی کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

مادۂ منویہ ان مختلف رطوبات سے بنتا ہے جو حسبِ ذیل غدود سے خارج ہوتی ہیں

(ا) خصیے: مرد کے تناسلی غدود کی رطوبت میں کرم منی شامل ہوتے ہیں جو نازک سے خلئے ہوتے ہیں اور رقیق خونابی سیال مادے میں جیسے نہائے ہوتے ہیں۔

(ب) منوی بلبلے (Seminal vesicles) : یہ گویا کرم منی کے خزانے ہوتے ہیں اور غدۂ قدامیہ (Prostategland) کے قریب واقع ہوتے ہیں۔ وہ اپنی رطوبت بھی خارج کرتے ہیں لیکن اس میں بارور کرنے والے اجزا نہیں ہوتے۔

(ج) غدۂ قدامیہ : اس سے ایک ایسی رطوبت خارج ہوتی ہے جو نطفہ کو ملائی کا سا رنگ روپ اور اس کی مخصوص بو دیتی ہے۔

(د) اعضائے بول سے ملحقہ غدود: کوپری یا میروی غدود ۔ (Cooper's or Mery's glands) ۔ لمبے ریشے کا سیال مادہ خارج کرتے ہیں جس پر لیسدار تہہ جمی ہوتی ہے اور لیٹر کے غدود (Littre's glands) چپچپا مادہ (Mucous) خارج کرتے ہیں۔

یہ ہیں ان 'مخلوط سیالات' (Mingled Liquids) کے سرچشمے جن کا ذکر محولہ بالا قرآنی آیات میں معلوم ہوتا ہے۔

لیکن مجھے بھی اس موضوع پر کچھ اور بھی کہنا ہے۔ جب قرآن مختلف اجزا سے مرکب بارور کرنے والے سیال (نطفے) کا ذکر کرتا ہے تو ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان کی نسل کی پرورش ایک ایسی چیز سے ہوگی جو اس سیال مادے (نطفے) کا ست یا خلاصہ ہوگی۔ سورۂ سجدہ (۳۲)

کی آٹھویں آیت کا یہی مطلب ہے:

"خدا نے اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصے سے پیدا کی"

یہاں عربی لفظ 'سُلالہ' کا ترجمہ خلاصہ کیا گیا ہے۔ اس سے مراد ہے "ایسی چیز جو کسی دوسری چیز سے نکالی، نچوڑی گئی ہو۔ کسی چیز کا ماحصل 'کسی چیز کا بہترین حصہ'" اس لفظ کا ترجمہ خواہ کسی طرح بھی کیا جائے، یہ کسی کُل کے جزو کی طرف اشارہ کرے گا۔

نسوانی بیضہ کی باروری (fertilization) اور تولید کا باعث ایک خلیہ ہوتا ہے جو بہت نازک، دراز اور گاؤدم (elongated) ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی، چوڑائی، موٹائی کی پیمائش کا حساب ایک ملی میٹر[1] کے دس ہزارویں حصے سے کیا جاتا ہے۔ عام حالات میں[2] ایک مرد کے نطفہ میں بیک وقت خارج ہونے والے کروڑوں خلیوں میں سے صرف ایک خلیہ ہی نسوانی بیضہ میں نفوذ کرتا ہے۔ ان خلیوں کی کثیر تعداد پیچھے رہ جاتی ہے اور فرج نسوانی سے رحم اور قناعت فلوپی سے گزر کر بیضۂ نسوانی تک اپنا سفر کبھی مکمل نہیں کر پاتی۔ لہٰذا اس بے حد پیچیدہ ترکیب والے سیال مادے (نطفے) کے خلاصے کا انتہائی قلیل حصہ حقیقت میں اپنا فرض منصبی ادا کرتا ہے۔

ان دریں حالات ان مظاہر سے متعلق قرآنی عبارات اور جدید سائنسی معلومات میں جو مطابقت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس پر ہم حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۳۔ بیضہ کا رحم نسوانی میں قرار پکڑنا

جب قناعت فلوپی میں بیضہ بارور ہو چکتا ہے تو یہ رحم میں قرار پکڑنے کے لیے اترتا ہے۔ اسے بیضہ کا استقرار یا تنصیب کہتے ہیں۔ قرآن بارور شدہ بیضہ کے ٹھکانا پکڑنے کو

---

[1] ایک ملی میٹر = ۰٫۰۳۹۳ انچ۔ مترجم

[2] اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک مکعب سنٹی میٹر نطفے میں ڈھائی کروڑ کرم منی ہوتے ہیں جب کہ عام حالات میں ایک انزال کئی مکعب سنٹی میٹر کا ہوتا ہے۔ مصنف

استقرار فی الرحم کہتا ہے:

سورۂ حج (۲۲) آیت ۵:۔

"ہم جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ماں کے رحم میں ایک مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔"

رحم میں بیضہ کا قرار پکڑنا لمبے، نرم، مخملیں، روئیں (villosities) کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ روئیں یا بال دراصل بیضہ ہی کی کھینچائیں (elongations) ہوتے ہیں اور جس طرح پودوں کی جڑیں زمین سے غذا حاصل کرتی ہیں اسی طرح یہ بھی بیضہ کی نشوونما کے لیے ضروری غذا رحم کی دبازت سے حاصل کرتے ہیں۔ ان تشکیلات (formations) کی بنا پر بیضہ یچ یچ رحم سے چمٹ جاتا ہے۔ وہ یہ جدید زمانے کا انکشاف ہے۔

اس چمٹنے کے عمل کو پانچ مختلف اوقات و مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے سورۂ علق (۹۶) کی آیات ۱۔۲ میں:

اقرأ باسم ربك الذی خلق ٥ خلق الانسان من علق ٥

ترجمہ:۔ "(اے محمدؐ) اللہ کا نام لے کر پڑھو جس نے (مخلوقات کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو چمٹنے والی چیز[1] سے پیدا کیا۔

'چمٹنے والی چیز' ترجمہ ہے لفظ 'علق' کا۔ یہ اس لفظ کے اصلی معنی ہیں۔ ترجمے میں اکثر اس سے اخذ کردہ مطلب 'خون کی پھٹکی' 'خون کا لوتھڑا' 'منجمد خون (blood clot)' وغیرہ دیا جاتا ہے۔ یہ ایک غلطی ہے جس سے بچنا چاہیے۔ انسان کی تخلیق میں یہ مرحلہ کبھی نہیں آیا کہ وہ 'خون کی پھٹکی' کی صورت میں رہا ہو۔ اس لفظ 'علق' کا ایک دوسرا ترجمہ التصاق[2] (adhesion) کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں بھی

---

[1] اکثر اردو مترجمین نے علق کا ترجمہ "خون کی پھٹکی" "خون کا لوتھڑا" وغیرہ کیے ہیں۔ مفسرین نے 'علق' کے معنی 'جونک' دئیے ہیں لیکن زیریں حواشی میں انگلش عربک ڈکشنری 'المنار' کے مصنف نے بھی 'عَلَقَة' کے معنی جونک ہی دئیے ہیں اور جونک چمٹنے والی چیز ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کی تخلیق جونک کی طرح چمٹنے والی شے سے ہوئی۔ مترجم

[2] انگریزی اور فرانسیسی زبان میں یہ ترجمہ شائد ہو۔ پکتھال اور عبداللہ یوسف علی کے انگریزی تراجم میں تو نہیں۔ مترجم

یہ بات صحیح ہے کیونکہ یہ ترجمہ بھی یکساں طور پر غیر موزوں ہے۔ اصلی ابتدائی معنی یعنی "چمٹنے والی چیز" (something that clings) ہی آج کی مسلّمہ حقیقت سے مطابقت رکھتے ہیں۔

یہی تصور چار دوسری آیات میں دہرایا گیا ہے جن میں ان تبدیلیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو رحم نسوانی میں ابتدا سے انتہا تک نطفہ پر وارد ہوتی ہیں۔

سورہ حج (۲۲) آیت ۵

فانا خلقنكم من . . . . علقة

ترجمہ:- ہم نے تمہیں . . . . . چمٹنے والی چیز سے بنایا۔

سورۂ مومنون (۲۳) آیت ۱۴

ثم خلقنا النطفة علقة . . . .

ترجمہ:- ہم نے نطفہ سے ایک چمٹنے والی چیز بنائی . . .

سورہ (۴۰)، آیت ۶۷:

هوالذی خلقكم . . . . . من نطفة ثم من علقة

ترجمہ:- خدا نے تمہیں نطفہ سے بنایا پھر ایک چمٹنے والی چیز سے . . . .

سورۂ (۷۵)، آیات ۳۷-۳۸:

ترجمہ:- کیا انسان محض منی کی ایک قلیل مقدار یعنی نطفہ نہ تھا جو رحم میں ڈالا گیا۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی چیز بنا جو چمٹتی ہے۔ پھر خدا نے اس کو انسان بنایا پھر اعضا درست کیے" جس عضو میں حمل قرار پکڑتا ہے، قرآن میں اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ اب بھی عربی زبان میں اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی 'رحم'۔ بعض سورتوں میں اسے 'قرار مکین'۔ مضبوط و محفوظ ٹھکانا۔ کہا گیا ہے۔ (۲۳:۱۳ اور ۷۷:۲۱)[1]۔

[1] ایک دوسری آیت (۶:۹۸) میں 'مُستَقَر'۔ عارضی ٹھکانا' کا ذکر ہے۔ 'مستقر' قرار سے بہت مشابہ ہے اور اس کا مطلب بھی 'رحم' ہی معلوم ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر میرے نزدیک اس آیت کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ) یہی مطلب ہے۔ لیکن اس کی مفصل تفسیر کے لیے زیادہ طویل توجیح و توضیح کی ضرورت ہوگی جس کی یہ کتاب متحمل نہیں ہو سکتی۔

ایک دوسری آیت جس کی بے حد نازک و لطیف تفسیر کی ضرورت ہے، یہ ہے:

سورہ الزمر (۳۹) آیت ۶:

يخلقكم فی بطون امهٰتكم خلقا من بعد خلق فی ظلمٰت ثلٰث ط

ترجمہ: (اللہ) تم کو تمہاری ماؤں کے جسموں کے اندر ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر بناتا ہے تین (پردہ ہائے) تاریکی میں'

قرآن کے جدید شارحین کو اس آیت میں تشریح الابدان کی وہ تین تہیں نظر آتی ہیں جو زمانہ حمل میں بچے کی حفاظت کرتی ہیں یعنی شکمی دیوار (Abdominal wall) خود رحم اور جنین کے گرد و پیش کی چیزیں (اوّل) جنینی جھلیاں (embryonic membranes) اور جنین کے گرد لپٹی ہوئی جھلیوں سے بالکل اندر کی جھلی کی رطوبت (amniotic fluid)

میں نے اس آیت کا حوالہ قطعیت کی خاطر دیا ہے۔ یہاں اس آیت کی جو تشریح کی گئی ہے وہ تشریح الابدانی نقطۂ نظر سے میرے نزدیک ریب و شبہ سے پاک ہے۔ لیکن کیا قرآنی عبارت کا واقعی یہی مطلب ہے؟

مصنف

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کے نزدیک قرآنی عبارت کے اور بھی وسیع تر معنی ہیں اور یہ عین ممکن ہے کیونکہ جوں جوں زمانہ گزرتا ہے اور نئے نئے علمی و سائنسی انکشافات سامنے آتے ہیں، قرآنی معانی کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔ شاید آئندہ چل کر اس آیت کے اور زیادہ مناسب معانی سامنے آئیں۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ پکتھال نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"He created you in the wombs of your mothers, creation after creation, in a threefold gloom

یعنی اس (خدا) نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کیا، ایک تخلیق کے بعد دوسری تخلیق تاریکی کی تین تہوں میں۔"

عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ یہ ہے: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۴- رحم کے اندر جنین کا ارتقاء

جنین کے ارتقاء کے معین مراحل کے بارے میں قرآن کا بیان ہو بہو ایسا ہی ہے جیسا کہ آج ہمیں معلوم ہے اور قرآن میں کوئی ایک بیان بھی ایسا نہیں جو جدید سائنسی نقطہ نظر سے قابلِ اعتراض ہو۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ 'علق' (چمٹنے والی چیز) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اس کا حق بجانب ہونا بھی متحقق ہو چکا) کے مرحلے سے گزرنے کے بعد جنین 'چبائے ہوئے گوشت (مضغہ) کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ تب ہڈیوں کی تشکیل ہوتی ہے اور ان پر گوشت پوست چڑھتا ہے (ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھنے کے لیے پہلے سے مختلف لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں 'سالم گوشت' (Intact flesh)۔

سورہ مومنون (۲۳) آیت ۱۴ ملاحظہ فرمائیے:

"خلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظما فكسونا العظم لحما۔

"He makes you in the wombs of your mothers in (بقیہ حاشیہ)

Stages one after another, in three veils of darkness.

یعنی وہ (اللہ) تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں مرحلوں میں بناتا ہے' ایک کے بعد دوسرا مرحلہ' تاریکی کے تین پردوں میں:"

مولانا مودودی نے اس آیت کا مفہوم یوں بیان کیا ہے:

"وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین باریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد دوسری شکل دیتا چلا جاتا ہے۔"

ان بزرگوں کے تراجم اور حواشی مصنف کی تشریح سے آگے نہیں جاتے ممکن ہے کسی دن کوئی مزید معنوی گرہ کھل جائے۔ مترجم

ترجمہ:- پھر ہم نے چمٹنے والی چیز (علق) کو چبائے ہوئے گوشت (مضغہ) میں تبدیل کر دیا اور چبائے ہوئے گوشت (مضغہ) کو ہڈیوں میں بدل دیا اور پھر ان ہڈیوں پر ہم نے سالم وثابت گوشت چڑھایا۔"

'چبایا ہوا گوشت' لفظ 'مضغہ' کا اور 'سالم وثابت گوشت' لفظ 'لحم' کا ترجمہ ہے۔

اس باہمی فرق و امتیاز پر زور دینا ضروری ہے۔ ابتدا میں جنین ایک چھوٹا سا لوتھڑا (Small mass) ہوتا ہے۔ اپنی نشوونما کے ایک مرحلے پر یہ ننگی آنکھ سے 'چبائے ہوئے گوشت' (مضغہ) کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں ماسارھی کیچوس (Mesenchyma) کی صورت میں نشوونما پاتی ہیں۔ ساخت پذیر ہونے والی ہڈیوں کو عضلات ڈھانپ لیتے ہیں۔ لفظ 'لحم' انہی کے لیے وارد ہوا ہے۔

آج ہم جانتے ہیں کہ جنین کی نشوونما کے دوران اس کے بعض حصے مستقبل کے فردِ انسانی کی شخصیت سے بالکل غیر متناسب معلوم ہوتے ہیں جبکہ دوسرے حصے متناسب ہی رہتے ہیں۔

لفظ 'مخلّق' کے یقیناً یہی معنی ہیں یعنی متناسب شکل یافتہ (Shaped in proparation) جیسا کہ سورۂ حج (۲۲) کی آیت ۵ میں بیان کیا گیا ہے:

فانا خلقنكم ثم من علقة ثم من مضغة مخلقة وغير مخلقة۔

ترجمہ:- ہم نے تم کو ... پھر چمٹنے والی چیز (علقہ) بنایا ... پھر گوشت کا لوتھڑا متناسب اور غیر متناسب۔"

قرآن حواس اور جسم کے ہر بڑے جوف کے اندر کے اعضا خصوصاً انتڑیوں (Viscerae) کی تشکیل اور ظہور کا بھی ذکر کرتا ہے۔

سورہ سجدہ (۳۲) کی آیت ۹ ملاحظہ ہو:

وجعل لكم السمع والابصار والافئدة۔

ترجمہ:- اللہ نے تم کو کان' آنکھیں اور انتڑیاں[1] دیں)

[1] یہاں اعضائے تناسل کی تشکیل کی طرف اشارہ ہے۔ (حاشیہ اگلے صفحے پر)

سورۂ النجم (۵۳) آیات ۴۵-۴۶:

"خدا ہی دونوں قسم یعنی نر اور مادہ کو نطفے سے بناتا ہے جب وہ رحم میں ڈالا جاتا ہے"

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) فاضل مصنف نے اَفئِدَہ کا ترجمہ viscerae کیا ہے جس کے انگریزی میں معنی ہوں گے The entrails 'The inner parts of the animal body'۔ اردو میں ترجمہ ہوگا 'احشا' امعاء جسم حیوانی کے ہر بڑے جوف کے اندر کے اعضا خصوصاً انتڑیاں۔

مصنف نے اس سے اعضائے تناسل کی تشکیل مراد لی ہے جو بظاہر دور کی کوڑی معلوم ہوتی ہے، اَفئِدَہ جمع ہے فُؤاد کی جس کے معنی دل ہیں نہ کہ انتڑیاں۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ نے انسان کو کان، آنکھیں اور دل دیئے۔ یہاں دل کے لغوی معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں یعنی جسم کا عضو رئیسہ۔ کانوں، آنکھوں کی طرح دل بھی جسم انسانی میں رکھ دیا گیا کہ زندگی کا مدار اس کی حرکت پر ہے لیکن جس طرح کان، آنکھ سے مراد سمع و بصر لی جا سکتی ہے، اسی طرح دل سے مراد احساس و شعور بھی ہو سکتے ہیں۔ مولانا مودودی کے نزدیک "دل (افئدہ) سے مراد وہ ذہن (mind) ہے جو اس کے ذریعے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے۔"

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMATE
MAYOTTE

دیکھئے سورۂ نجم کی آیت ۱۱

ماکذب الفؤاد ما رأی ... (ای یعنی جو کچھ (پیغمبرؐ نے) دیکھا دل نے اسے جھوٹ نہ جانا۔ یہاں سے فواد سے مراد دل سے ابھرنے والا احساس و شعور ہے نہ کہ انتڑیاں۔

مترجم نے visceraе کے جو انگلش اور اردو معنی اوپر دیئے ہیں وہ بالترتیب چیمبرز ٹوینٹیتھ سنچری ڈکشنری اور اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری (مولفہ مولوی عبدالحق) سے ماخوذ ہیں اور فواد سے میل نہیں کھاتے۔ اعاذار انگلش۔ عربک ڈکشنری کا مصنف انگریزی لفظ 'ہارٹ' کا عربی مترادف 'فواد' دیتا ہے یعنی دل محمد مارماڈیوک پکتھال نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن میں اَفئِدَہ کا ترجمہ 'ہارٹ' (دل) دیا ہے جبکہ عبداللہ یوسف علی نے "فیلنگ اینڈ انڈر اسٹینڈنگ" دیا ہے یعنی احساس و شعور۔

لہٰذا ڈاکٹر مارس بوکائی نے اَفئِدَہ کا جو ترجمہ visceral دیا ہے وہ ان کی اپنی ایجاد ہے۔ کانوں آنکھوں کی مناسبت سے دل کا ذکر یہاں زیادہ موزوں اور قرینِ قیاس ہے۔ مترجم

قرآن کی دو سورتوں میں اعضائے تناسل کی تشکیل کا ذکر آیا ہے:-

سورۂ فاطر (۳۵)، آیت ۱۱:

"اور اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر تم کو جوڑے جوڑے (نر اور مادہ) بنایا"۔

سورۂ قیامۃ (۷۵) آیت ۳۹

"پھر اللہ نے انسان کو جوڑا بنایا، نر اور مادہ"

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قرآن کے تمام بیانات کا مقابلہ و موازنہ آج کے مسلمہ تصورات سے کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں کی مطابقت بالکل واضح ہے۔ تاہم نزولِ قرآن کے وقت لوگوں میں اس بارے میں جو عام اعتقادات پائے جاتے تھے ان کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا بہت اہمیت رکھتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس زمانے میں ان مسائل پر لوگوں کے خیالات قرآن کے خیالات سے کتنے مختلف تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ قرآنی تنزیلات کی تعبیر و تشریح اس طرح کرنے کے قابل نہ تھے جس طرح آج ہم کرتے ہیں کیونکہ ہمیں ان معلومات و کوائف سے مدد ملتی ہے جو جدید علم نے ہمیں مہیا کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے کا لوگوں کو قدرے واضح تصور انیسویں صدی ہی میں حاصل ہوا۔

سارے ازمنۂ وسطیٰ کے دوران میں بھانت بھانت کے نظریئے بے بنیاد خرافات اور قیاس آرائیوں پر قائم کئے جاتے رہے جو بعد میں بھی کئی صدیوں تک باقی رہے۔ جنیات کی تاریخ میں سب سے بنیادی بیان ہاروے (۱۶۵۱ء) کا تھا کہ "ہر قسم کی زندگی کا آغاز ایک بیضے سے ہوتا ہے" تاہم اس زمانے میں جب کہ نوشگفتہ سائنس کو خوردبین کی ایجاد سے (موضوع زیرِ بحث کے سلسلے میں) بہت فائدہ پہنچا تھا، لوگ بدستور بیضے اور کرم منی کے اپنے اپنے کردار یا فرض منصبی کی باتیں کرتے تھے۔ عظیم ماہر حیوانیات و نباتات بفون بھی ان میں شامل تھا جو نظریۂ بیضہ کے حامی تھے لیکن بونٹ (Bonnet) اس نظریئے کا حامی تھا کہ تخم (حیات) "باہم اکٹھے کچھا کھچ بھر دیئے جاتے ہیں" (Packed together)۔ یہ فرض کیا جاتا تھا کہ نوعِ انسانی کی ماں حوا کے بیضہ دانوں میں تمام افراد انسانی کے تخم ایک دوسرے کے اندر

کپھا پکچھ بھر دیے گئے تھے۔ اس مفروضے کو اٹھارہویں صدی میں قبولیت حاصل ہوئی۔

ہمارے زمانے سے ایک ہزار سال سے زائد عرصہ پہلے ایک ایسے وقت میں جب عجیب وغریب اور متلون قسم کے نظریے ہنوز رائج تھے، لوگوں کو قرآن کا علم حاصل ہوا۔ قرآن کے سادہ الفاظ وبیانات میں ایسے بنیادی اہمیت رکھنے والے حقائق کا ذکر کیا گیا ہے جنھیں دریافت کرنے کے لیے انسان کو صدیاں لگ گئیں۔

قرآن اور جنسی تعلیم

یقین کیا جاتا ہے کہ ہمارے عہد میں علم وتحقیق کے تمام شعبوں میں بے شمار انکشافات ہوئے ہیں۔ جنسی تعلیم کے میدان میں بڑی جدتیں اور اختراعیں کی گئی ہیں۔ زندگی کے حقائق کا جو علم اب نوجوان مردوں، عورتوں کو حاصل ہے، وہ جدید دنیا کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ گزشتہ صدیوں میں جنسی معلومات جان بوجھ کر چھپائی جاتی تھیں اور اس کا باعث (کسی مذہب کا نام لیے بغیر) مذہب کو سمجھا جاتا تھا۔

لیکن اوپر جو معلومات دی گئی ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی توالد وتناسل کے بارے میں خالص علمی سوالات کی طرف انسان کی توجہ منعطف کرائی گئی تھی۔ اس امر واقعہ کے باوجود کہ مزید توضیح وتوجیہ کے لیے تشریح اعضا سے متعلق کوائف ومعلومات کا فقدان ہے، حتی الوسع ایسا کیا گیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اپنی بات سمجھانے کے لیے ایسی سادہ وآسان زبان کا استعمال ضروری تھا جو دعوت وتبلیغ کے سامعین کے فہم وشعور کی سطح سے مناسبت رکھتی ہو اور اس سے بالاتر نہ ہو۔

عملی تاملات کو خاموشی سے نظر انداز نہیں کر دیا گیا۔ قرآن میں زندگی کے عام عملی پہلو کے متعلق بہت سی تفصیلات ملتی ہیں نیز یہ بھی کہ انسان کو اپنی ہست وبود کی مختلف حالتوں میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ انسان کی جنسی زندگی اس سے مستثنیٰ نہیں قرآن کی دو آیتیں خود جنسی تعلقات کے بارے میں ہیں۔ ان کے الفاظ نہ صرف موضوع کو صحت سے بیان کرتے ہیں بلکہ تہذیب وشائستگی کے بھی حامل ہیں۔ لیکن جب ترجموں اور

تفسیروں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو ان کے باہمی اختلافات پر حیرت ہوتی ہے۔ میں ایسی آیات کے ترجموں پر طویل عرصے تک غور کرتا رہا۔ ذیل میں جو ترجمے دئیے جا رہے ہیں ان کے لیے میں فیکلٹی آف میڈیسن کے سابق پروفیسر ڈاکٹر اے۔ کے جیرادم کا ممنون ہوں۔

سورہٴ طارق (۸۶) آیات ۶۔۷

"(Man) was fashioned from a liquid power out. It issued (as a result). of the conjunction of the sexual area of the man with the sexual area of the woman.

"انسان اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو مرد کے جنسی حصے کے عورت کے جنسی حصے کے ساتھ میل سے نکلتا ہے۔"

قرآن کی عبارت میں مرد کے جنسی حصے کے لیے صلب (صیغہٴ واحد) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جب کہ عورت کے جنسی حصوں کو 'ترائب' (صیغہٴ جمع) کا نام دیا گیا ہے۔

یہ ہے وہ ترجمہ جو سب سے زیادہ اطمینان بخش معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان ترجموں سے مختلف ہے جو اکثر انگریزی اور فرانسیسی مترجمین دیتے ہیں۔ مثلاً

"(Man) has been created by a liquid powder poured out which issue from between the vertebral column and the bones of the breast."

"(انسان) اچھل کر نکلنے والے سیال سے پیدا کیا گیا ہے جو ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔"

---

[1] محمد مارماڈیوک پکتھال نے یہ ترجمہ دیا ہے:- He is created from a gushing fluid that issued from between the loins and

بہت عرصے پہلے کسی ڈاکٹر نے انگریزی روزنامہ ڈان (کراچی) میں بھی ایسا ہی اعتراض کیا تھا جس کے جواب میں ایک دوسرے ڈاکٹر نے مروجہ تصور کو حق بجانب قرار دیا تھا۔ مترجم

یہ ترجمے سے زیادہ تشریح ہے اور مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے۔

عورت کے ساتھ انتہائی ذاتی گہرے اور بے تکلف تعلقات کے دوران میں مرد کا جو رویہ ہوتا ہے، اسے یہاں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ بقرہ (۲) کی آیات ۲۲۲-۲۲۳ میں زمانہ حیض کے متعلق خدا پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حسبِ ذیل حکم دیتا ہے:-

"وہ (مسلمان) آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ گندی چیز ہے۔ حیض میں تم عورتوں سے الگ رہا کرو اور ان سے قربت مت کیا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔ پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جس طریق سے خدا نے تمھیں حکم دیا ہے۔ یقیناً اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے اور محبت رکھتا ہے پاک صاف رہنے والوں سے۔ "تمھاری بیویاں تمھاری کھیتی ہیں۔ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ اور اپنے لیے (نیک عمل) آگے بھیجو۔"

اس عبارت کی ابتدا اپنے معنی کے لحاظ سے بالکل واضح ہے، اس میں حائضہ عورت سے جنسی تعلق سے منع کیا گیا ہے۔ عبارت کے دوسرے حصے میں کاشتکاری کا عمل بیان کیا گیا ہے جو بونے والا بیج بونے سے پہلے بجا لاتا ہے تاکہ وہ اُگ کر نیا پودا پیدا کرے۔ لہٰذا اس استعارہ کے ذریعے بالواسطہ طور پر اس بات کی اہمیت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جنسی مقاربت کا آخری اور قطعی مقصد توالد و تناسل ہے۔ یہ حکم جنسی مقاربت سے پہلے کے ابتدائی امور و انتظامات سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔

یہاں جو احکام دئے گئے ہیں وہ بہت عام نوعیت کے ہیں۔ ان آیات کے حوالے سے ضبطِ تولید کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ لیکن اس موضوع سے متعلق نہ یہاں نہ کہیں اور کوئی اشارہ کیا گیا ہے۔ نہ یہاں اسقاطِ حمل کا کوئی ذکر ہے۔ جنین کی حالت میں یکے بعد دیگرے واقع ہونے والی تبدیلیوں کے متعلق جن متعدد آیات کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، ان سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انسان "چمٹنے والی چیز" (علقہ) کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد متشکل اور نمو پذیر ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن میں فردِ انسانی کے لیے بار بار جس مطلق احترام کا ذکر آیا ہے، اس کے

پیشِ نظر اسقاطِ حمل (Provoked abortion) کو کامل طور پر مذموم و ممنوع ہی قرار دیا جاتا ہے۔ آج تمام توحید پرست مذاہب اسی نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔[1]

رمضان کے روزوں کے دوران میں راتوں کو شوہروں، بیویوں کو باہمی جنسی تعلقات کی اجازت ہے۔ دیکھئے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱۸۷:

"روزوں کی راتوں میں تمھارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے۔ وہ تمھاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو ..... (اب تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو اور خدا نے جو چیز تمھارے لیے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد) اس کو (خدا سے) طلب کرو۔"

اس کے برعکس ایامِ حج میں حاجیوں کو مکہ میں اس قانون سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۷:-

"جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے تو حج (کے دنوں) میں نہ عورتوں سے اختلاط کرے اور نہ کوئی برا کام کرے۔"

یہ ممانعت قطعی ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ شکار اور لڑائی جھگڑا وغیرہ منع ہیں۔

طلاق کے سلسلے میں قرآن میں پھر حیض کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ طلاق (۶۵) کی آیت ۴ دیکھئے:

والٓئِ یئسن من المحیض من نسآئکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر والٓئِ لم یحضن ط واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن[2]

[1] عیسائیت کو توحید پرستی کا دعویٰ ہے لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اس کے پیروؤں نے برطانیہ اور امریکہ میں اسقاطِ حمل کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا ہے جب کہ کسی نام نہاد اسلامی ملک نے بھی ایسا نہیں کیا۔ مترجم

[2] لیکن فاضل مصنف نے اس آیت کا ترجمہ حسبِ ذیل دیا ہے:

"For your wives who despair of menstruation, if you doubt about them, their period of waiting will be three months for

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ترجمہ:۔ اور تمہاری (مطلقہ) عورتیں جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تم کو (ان کی عدت کے بارے میں) شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور جن کو ابھی حیض نہیں آنے لگا (ان کی عدت بھی یہی ہے) اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔"

یہاں زمانۂ عدت سے مراد طلاق کے اعلان اور اس کے موثر و نافذ کے درمیان کا زمانہ ہے۔ جن عورتوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ "وہ حیض سے ناامید ہو چکی ہیں" وہ ہیں جو سنِ یاس کو پہنچ چکی ہیں۔ ان کے لیے تین ماہ کی احتیاطی مدت مقرر کی گئی ہے۔ اس مدت کے اختتام پر سنِ یاس کو پہنچی ہوئی مطلقہ عورتیں دوبارہ نکاح کر سکتی ہیں۔

جن عورتوں کو ابھی حیض نہ آنے لگا ہو ان کے لیے زمانۂ حمل کا انتظار کرنا پڑے گا[1]۔ جہاں تک

(بقیہ حاشیہ)

those who never have their months period and those who are freqnant their period will be until the lay down their burden."

اس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہوگا:۔

"تمہاری بیویاں جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تم کو (ان کی عدت کے بارے میں) شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ جن کو کبھی حیض نہیں آتا اور وہ جو حاملہ ہوں، ان کی عدت وضع حمل ہے۔"

یہاں دوسری قسم کی عورتوں یعنی جنھیں ابھی حیض نہیں آنے لگا کو میعادِ عدت کے لیے تیسری قسم کی عورتوں یعنی حمل والیوں کے ساتھ ملا دیا گیا ہے حالانکہ انھیں مدتِ عدت کے لیے پہلی قسم میں شامل ہونا چاہیے۔ مترجم

[1] فاضل مصنف کا فقرہ یہ ہے:

"For those who have not yet menstruated, the freqnancy period has to be awaited."

یہ فقرہ مبہم ہے اور خود مصنف نے آیت کا جو ترجمہ دیا ہے اس سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ آیت کا سیاق عبارت اور اس دوسری قسم کی عورتوں کے ذکر یعنی   کے بعد وقف مطلق (ط) کا آنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ زمانۂ عدت کے لیے پہلی قسم کے ساتھ شامل ہیں۔ مترجم

حاملہ عورتوں کا تعلق ہے، ان کی عدت بچہ پیدا ہونے تک ہے

یہ تمام قوانین جدید عضویاتی معلومات و کوائف سے پوری مطابقت رکھتے ہیں۔ مزید براں قرآن میں بیواؤں کے بارے میں بھی اسی قسم کی مدبرانہ و منصفانہ قانونی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طرح توالد و تناسل کے بارے میں نظری بیانات اور میاں بیوی کی جنسی زندگی سے متعلق عملی ہدایات جدید علمی کوائف و معلومات سے متصادم نہیں ہوتیں نہ جدید معلومات سے منطقی طور پر اخذ کی جانے والی کسی بات سے تضاد و تخالف کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

۸

قرآن اور بائبل کی روایات

عام خاکہ

بائبل کے بہت سے مضامین قرآن میں بھی پائے جاتے ہیں سب سے پہلے تو وہ روایات و بیانات ہیں جو پیغمبروں سے متعلق ہیں۔ نوحؑ، ابراہیمؑ، یوسفؑ، الیاسؑ، یونسؑ، ایوبؑ اور موسیٰؑ (علیہم السلام اجمعین) اور سلاطین اسرائیل ساؤل (طالوت)، داؤدؑ اور سلیمانؑ[1] مشتے نمونہ از خروارے۔ وہ چند شخصیات ہیں جن کے متعلق قرآن اور بائبل میں روایات مشترک ہیں۔ پھر عظیم واقعات کے بارے میں بیانات ہیں جن میں مافوق الفطرت عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ مثلاً زمین اور آسمانوں کی تخلیق، انسان کی تخلیق، طوفان (نوح) اور خروج۔ آخر میں جہاں تک عہد نامۂ جدید کا تعلق ہے، وہ سب کچھ بھی ہے جس کا تعلق یسوع مسیحؑ اور ان کی والدہ مریم سے ہے۔

ان دونوں مقدس کتابوں میں جو موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں، ان پر جب ہم اس جدید علم کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں جو مختلف سماوی سے ماورا ذرائع سے حاصل ہوا ہے تو ہمارا تاثر کیا ہوتا ہے۔

قرآن۔ اناجیل اور جدید علم

جہاں تک قرآن/اناجیل کے متوازی بیانات و روایات کا تعلق ہے، ضروری ہے کہ ہم

[1] قرآن کی رو سے داؤدؑ اور سلیمانؑ پیغمبر بھی ہیں اور بادشاہ بھی جب کہ بائبل کے نزدیک وہ محض بادشاہ تھے۔ مترجم

پہلے یہ بات نوٹ کر لیں کہ اناجیل کے وہ مضامین جن پر سائنسی نقطۂ نظر سے نکتہ چینی کی گئی ہے، ان میں سے ایک بھی قرآن میں نہیں پایا جاتا (دیکھئے "بائبل جدید سائنس کی روشنی میں") قرآن میں یسوع مسیحؑ کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً فرشتے کا یسوعؑ کی معجزانہ پیدائش کی بشارت مریم کو دینا، یسوعؑ کی پیغمبرانہ عظمت، مسیح کی حیثیت سے ان کا کردار، ان پر تورات کی تصدیق اور ترمیم کرنے والی وحیٔ آسمانی کا نزول، ان کی دعوت و تبلیغ، ان کے شاگرد اور حواری، معجزات، رفع الی السماء، قیامت کے دن ان کا کردار، وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کی تیسری سورت (آلِ عمران) اور انیسویں سورت (جو حضرت مریم کے نام سے موسوم ہے) میں یسوعؑ کے خاندان کے متعلق طویل عبارتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں یسوع کی والدہ مریم کی پیدائش، جوانی اور معجزانہ طور پر ماں بننے کا بیان ہے۔ یسوعؑ کو ہمیشہ ابن مریم کہا گیا ہے ان کا نسب صرف ان کی والدہ کی طرف سے دیا گیا ہے جو اپنے اندر معقولیت رکھتا ہے کیونکہ یسوعؑ کا کوئی جسمانی باپ نہ تھا، یہاں قرآن اور لوقا کی انجیلوں سے اختلاف کرتا ہے جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں مذکورہ انجیلوں میں یسوعؑ کے پدری شجرہ ہائے نسب دئیے گئے ہیں اور پھر وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

قرآن میں یسوع کو ان کی والدہ کے شجرۂ نسب کے مطابق نوحؑ، ابراہیم اور مریم کے باپ (قرآن کے مطابق عمران) کی لائن میں رکھا گیا ہے۔

سورۂ آل عمران (۳)، آیات ۳۳۔۳۴:۔

"خدا نے آدم، نوح اور خاندان ابراہیم اور خاندان عمران کو تمام جہان کے لوگوں میں منتخب فرمایا تھا۔ ان میں سے بعض بعض کی اولاد تھے۔"

پس اپنی والدہ کی طرف سے یسوعؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ اور اپنی والدہ کے باپ عمران کی نسل سے ہیں۔ اناجیل میں 'یسوع کے اسلاف' کے اسماء میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں وہ قرآن میں موجود نہیں اور عہد نامۂ عتیق میں ابراہیمؑ کے اجداد کے شجروں میں جو ناممکن باتیں درج ہیں، قرآن میں ان کا بھی کوئی ذکر نہیں۔

معروضی نقطۂ نظر سے اس امر واقعہ کو نوٹ کرنا ضروری ہے اور ان بے بنیاد دعوؤں

کے مقابلے میں اس کی بڑی اور واضح اہمیت ہے کہ قرآن کے مصنف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زیادہ تر بائبل کے بیانات نقل کرتے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو جائے حیرت ہے کہ کس نے یا کن وجوہات نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یسوع کے شجرۂ نسب سے متعلق بائبل کی عبارات کو نقل کرنے سے باز رکھا اور ان کی جگہ اس مقام پر قرآن میں وہ تصحیحات درج کیں جنھوں نے قرآن کے متعلقہ متنوں کو جدید علم کی روشنی میں نکتہ چینی سے بالاتر کر دیا۔ اناجیل اور عہد نامۂ عتیق کے متن اس کے بالکل برعکس ہیں اور اس نقطۂ نظر سے سراسر ناقابلِ تسلیم۔

قرآن، عہد نامۂ عتیق اور جدید علم: مقابلہ و موازنہ

جہاں تک عہد نامۂ عتیق کا تعلق ہے' اس کتاب کے پہلے حصے (بائبل جدید سائنس کی روشنی میں) میں اس کے بعض پہلوؤں پر بحث کی جا چکی ہے۔ مثلاً تخلیق کائنات کے بارے میں عہد نامۂ عتیق کے بیانات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ قرآنی تنزیلات کی روشنی میں بھی اس موضوع کا جائزہ لیا گیا اور پھر عہد نامہ عتیق اور قرآن کے بیانات کا مقابلہ و موازنہ کیا گیا۔ لہٰذا یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تاریخی معلومات اس قدر مبہم ہیں اور اثری مواد اس قدر کمیاب کہ سلاطین اسرائیل' جن کا ذکر بائبل کے علاوہ قرآن میں بھی ہے' کے بارے میں جدید علم کی روشنی میں کوئی تقابل و موازنہ قائم کرنا ممکن نہیں۔

آیا انبیا کا معاملہ جدید معلومات کی روشنی میں طے کیا جا سکتا ہے یا نہیں' اس کا انحصار بیان کردہ واقعات کے آثار باقیہ کی وسعت پر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہم تک پہنچے ہوں یا نہ پہنچے ہوں۔

تاہم دو موضوع ایسے ہیں جن کا بیان قرآن میں بھی آیا ہے اور بائبل میں بھی اور وہ ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ جدید علم کی روشنی میں ان کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

طوفانِ نوح

خروج

اول الذکر اس لیے توجہ اور تحقیق کا مستحق ہے کہ تہذیب و تمدن کی تاریخ میں اس کے کوئی آثار باقی نہیں رہے جن سے بائبل کے بیان کی تصدیق ہو سکتی اور جدید معلومات قرآن کے بیان پر نکتہ چینی کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔

ثانی الذکر اس لیے تحقیق طلب ہے کہ بائبل اور قرآن کے بیانات اپنی اہم اور نمایاں خصوصیات میں ایک دوسرے کا تکملہ ہیں اور جدید معلومات سے دونوں کو حیرت انگیز طور پر تاریخی تائید و تصدیق فراہم ہوتی ہے۔

۲۔ طوفانِ نوح

طوفانِ نوح کے متعلق بائبل کا بیان اور اس پر جو تنقید و نکتہ چینی کی گئی ہے ــــ ایک یاد دہانی

اس کتاب کے پہلے حصے (بائبل جدید سائنس کی روشنی میں) میں طوفانِ نوح کے بارے میں عہد نامۂ عتیق کے بیان کا جو جائزہ لیا گیا' اس سے ہم ان نتائج پر پہنچے:۔

طوفان کے بارے میں صرف ایک ہی بیان نہیں بلکہ دو ہیں جو مختلف اوقات پر تحریر کیے گئے:

۔ یہووائی نسخہ جو نویں صدی قبل مسیح میں لکھا گیا۔

۔ عہد نامۂ عتیق کے مشائخی نسخے (Sacerdotal version) کا بیان جو چھٹی صدی قبل مسیح میں لکھا گیا۔ یہ نام اسے اس لیے دیا گیا کہ اسے اس عہد کے یہودی مذہبی پیشواؤں نے لکھا تھا۔

یہ دونوں بیانات پہلو بہ پہلو نہیں رکھے گئے بلکہ انھیں باہم اس طرح گوندھ دیا گیا کہ ایک کا حصہ دوسرے کے حصوں کے درمیان جوڑ دیا گیا ہے یعنی ایک ماخذ کے پیراگراف دوسرے کی عبارتوں کے ساتھ باری باری آتے ہیں۔ یروشلم کے بائبلی اسکول کے پروفیسر فادر

ڈی واکس کے شرح و تبصرہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح دونوں ماخذوں کے درمیان پیراگراف تقسیم کردئے گئے ہیں۔ طوفان کا بیان یہوواتی نسخہ کی عبارت سے شروع ہوتا ہے اور اسی نسخے کی عبارت پر ختم ہوتا ہے۔ یہوواتی نسخے کے کل دس پیراگراف ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے درمیان مشائخی نسخے کی عبارت داخل کر دی گئی ہے (مشائخی نسخے کے کل نو پیراگراف ہیں) متنوں کی یہ یکجا کاری صرف اسی وقت مربوط اور یسیرالفہم صورت اختیار کرتی ہے جب ایسے واقعات کے تواتر کو ذہن میں رکھتے ہوئے پڑھا جائے کیونکہ دونوں ماخذوں میں کھلے کھلے تضادات پائے جاتے ہیں۔ فادر ڈی واکس انھیں "طوفان کی دو تفصیلات" کہتا ہے۔ دونوں میں طوفان عظیم کے واقع ہونے کے اسباب مختلف بیان کئے گئے ہیں اور طوفان کی مدت بھی مختلف بیان کی گئی ہے اور کشتیٔ نوح میں لے جانے والے جانوروں کی تعداد بھی مختلف دی گئی ہے۔"

طوفانِ نوح کا جو حال بائبل میں بیان کیا گیا ہے جب اس پر ہم جدید علم کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں تو وہ مجموعی حیثیت سے مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ناقابلِ قبول معلوم ہوتا ہے:

ا۔ عہد نامۂ عتیق کے مطابق یہ عالمگیر طوفان تھا۔

(ب) یہوداتی متن میں طوفان کا زمانۂ وقوع نہیں دیا گیا۔

اور مشائخی متن میں اس کا وقوع ایک ایسے زمانے میں بتایا گیا ہے۔ جب اس قسم کے طوفانِ عظیم کا وقوع ممکن نہ تھا۔ حسبِ ذیل دلائل سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے:

مشائخی متن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ طوفان اس وقت آیا جب نوحؑ کی عمر چھ سو سال تھی۔ 'کتاب پیدائش' کے پانچویں باب میں جو نسبت نامے درج ہیں (اس کتاب کے پہلے حصے ۔ 'بائبل جدید سائنس کی روشنی میں' میں یہ نسبت نامے مشائخی متن کے حوالے سے نقل کئے جا چکے ہیں) ان کے مطابق نوحؑ آدمؑ سے ۱۰۵ سال بعد پیدا ہوئے نتیجتاً آدمؑ کی تخلیق کے ۱۶۵۵ سال بعد طوفان آیا ہوگا! مزید براں ابراہیمؑ کا نسب نامہ جو 'کتابِ پیدائش' کے مشائخی متن (۱۱: ۱۰-۳۲) میں دیا گیا ہے اس سے ہم اندازہ لگاتے ہیں کہ ابراہیمؑ طوفان کے ۲۹۲ سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے بائبل کے مطابق ابراہیم ۱۸۵۰ قبل مسیح میں زندہ تھے۔ اس لئے طوفان کا زمانۂ وقوع اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح متعین

ہوتا ہے۔ یہ حساب بائبل کے پرانے ایڈیشنوں میں مندرج معلومات کے عین مطابق ہے۔ یہ معلومات بائبل کے پرانے ایڈیشنوں کے متن کے شروع میں نمایاں طور پر درج ہوتی تھیں وہ ایسا زمانہ تھا کہ اس موضوع پر انسان کا علم بہت قلیل بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا اس لئے بائبل میں تاریخی واقعات کے متعلق مندرج معلومات کو قارئین بلا چوں وچرا تسلیم کر لیتے تھے کیونکہ ان کے خلاف کوئی دلائل وغیرہ میسر نہ تھے۔[1]

آج یہ تصور کرنا ممکن نہیں کہ اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح میں ایک ایسا طوفان عظیم آیا جس سے روئے زمین پر ہر قسم کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا (سوائے ان انسانوں اور جانوروں کے جو کشتیٔ نوح میں سوار ہوگئے تھے) تب تک دنیا کے متعدد حصوں میں تہذیب و تمدن قائم ہو چکا تھا اور اس کے آثار و علامات پائے گئے ہیں۔ مثلاً اس زمانے کے مصر میں 'سلطنت قدیم' کے بعد "عبوری دور" شروع تھا۔ اس کے بعد سلطنتِ وسطیٰ کا آغاز ہوا۔ اس عہد کی تاریخ کا جو علم ہمیں حاصل ہے اس کے پیشِ نظر یہ دعویٰ کرنا مضحکہ خیز ہوگا کہ طوفانِ نوح کی وجہ سے دنیا بھر کا تہذیب و تمدن تباہ و برباد ہوگیا تھا۔

لہٰذا تاریخی نقطۂ نظر سے یہ بات وثوق اور دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ بائبل میں جو طوفان کا بیان ہے وہ کھلم کھلا طور پر جدید معلومات کے خلاف ہے۔ دو متنوں کی موجودگی ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ بائبل کا متن انسانی ہاتھوں کی کارستانی اور تحریف و ترمیم کا شکار ہوا ہے۔

---

[1] اب جب کہ قدیم زمانوں کے تاریخ وار واقعات کے متعلق بعض نظریات و آراء کی حیثیت مسلم ہو چکی ہے اور عہد نامۂ عتیق کے مشائخی متن کے مصنفوں کی دی ہوئی فرضی تاریخوں پر سے اعتبار اٹھ چکا ہے، وہ تاریخیں بڑی سرعت سے بائبل سے حذف کر دی گئی ہیں۔ جو نسب نامے برقرار رکھے گئے ہیں، عام اشاعت کی کتابوں کے شارحین ان نسب ناموں کی غلطیوں کی طرف قارئین کی توجہ منعطف نہیں کرتے۔

مصنف

طوفان نوح کے متعلق قرآن کا بیان

قرآن میں طوفان کے بارے میں ایک عمومی بیان ملتا ہے جو بائبل کے بیان سے مختلف ہے اور تاریخی نقطۂ نظر سے اس پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی۔

قرآن میں طوفان کا مسلسل بیان نہیں پایا جاتا۔ متعدد سورتوں میں قومِ نوح پر واقع ہونے والے عذاب کا ذکر ملتا ہے۔ سب سے مکمل بیان سورۂ ہود (۱۱) کی آیات ۲۵ تا ۴۹ میں ہے۔ اکہترویں سورت جو نوحؑ کے نام پر ہے، اس میں زیادہ تر نوحؑ کی تعلیمات کا بیان ہے اسی طرح سورۂ شعراء (۲۶) کی آیات ۱۰۵ تا ۱۱۵ میں بھی نوحؑ کی دعوت و تبلیغ کا ذکر ہے، واقعات نے جو رخ اختیار کیا اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم طوفان کے بارے میں قرآن کے بیان کو اس عذابِ خداوندی کے عام چوکھٹے میں جوڑ کر دیکھیں اور غور کریں جو خدا نے ان قوموں پر نازل کیا جنھوں نے اس کے احکام کی سخت نافرمانی کی۔

بائبل تو ایک ایسے عالمگیر طوفان کا حال بیان کرتی ہے جس کا منشا ناخدا ترس اور بدکار انسانوں کو مجموعی حیثیت سے سزا دینا تھا۔ اس کے برعکس قرآن متعدد عذابوں کا ذکر کرتا ہے، جو خاص خاص قوموں پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے نازل ہوئے۔

اس کے لیے سورۂ فرقان (۲۵) کی آیات ۳۵ تا ۳۹ دیکھئے:-

"ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے بھائی ہارون کو ان کا مددگار بنایا اور کہا کہ دونوں ان لوگوں کے پاس جاؤ جنھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی (جب تکذیب پر اڑے رہے) تو ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ اور نوحؑ کی قوم نے بھی جب پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے انھیں غرق کر دیا اور لوگوں کے لیے نشانی بنا دیا۔ اور ظالموں کے لیے ہم نے دکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور عاد اور ثمود اور کنوئیں والوں اور ان کے درمیان اور بہت سی جماعتوں کو بھی ہلاک کر دیا۔

اور سب کے سمجھانے کے لیے ہم نے مثالیں بیان کیں اور (نہ ماننے پر) سب کو

تہس نہس کر دیا۔"

سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۵۹ تا ۹۳ میں ان عذابوں کی یاد دہانی کرائی گئی ہے جو بالترتیب قومِ نوحؑ، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوطؑ اور اہلِ مدین پر نازل کیے گئے۔

یوں قرآن اس طوفانِ عظیم کو ایک عذاب قرار دیتا ہے جو خاص طور پر قومِ نوح پر نازل کیا گیا۔ بائبل اور قرآن کے بیان میں یہ پہلا بنیادی فرق ہے۔

دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ بائبل کے برخلاف قرآن طوفان کا زمانہ وقوع نہیں دیتا اور نہ اس کے دوران کی مدت کا کوئی ذکر کرتا ہے۔

طوفان کے اسباب تقریباً دونوں بیانات میں ایک جیسے ہیں۔ بائبل کے متائخی نسخے (پیدائش ۷ : ۱۱) میں دو سبب بیان کئے گئے ہیں جو بیک وقت واقع ہوئے:

"اس دن بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔"

قرآن کی سورۂ قمر (۵۴) کی آیات ۱۱۔۱۲ میں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے:-

"پس ہم نے زور کے مینہ سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین سے چشمے جاری کر دیئے پھر (آسمان اور زمین کا) پانی اس کام کے (پورا ہونے کے) لیے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا۔"

قرآن کشتیٔ نوح کے یات بڑی صحت سے بیان کرتا ہے۔ خدا نے نوحؑ کو جو حکم دیا تھا اس کی پوری طرح تعمیل کی گئی اور وہ یہ تھا:

سورۂ ہود (۱۱) آیت ۴۰:-

"(ہم نے نوحؑ کو حکم دیا کہ) ہر قسم کے جانداروں میں سے جوڑا جوڑا (یعنی دو دو جانور ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ) لے لو۔ اور جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے (کہ ہلاک ہو جائے گا) اس کو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو اور جو ایمان لایا ہو اس کو کشتی میں سوار کر لو اور ان کے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے تھے۔"

یہاں خاندان سے جسے مستثنیٰ کرنے کی طرف اشارہ ہے وہ نوحؑ کا نافرمان بیٹا تھا۔

نافرمانی یعنی عملِ غیر صالح کی وجہ سے اسے خاندان میں شمار نہیں کیا گیا۔ سورۂ ہود کی آیات ۴۵۔۴۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسے نوحؑ نے اس بیٹے کو بچانے کے لیے خدا سے التجائیں کیں لیکن خدائی حکم میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ نوحؑ کے خاندان (نافرمان بیٹے کو چھوڑ کر) کے علاوہ قرآن کشتی کے دوسرے مسافروں کا بھی ذکر کرتا ہے جو خدا پر ایمان لے آئے تھے۔

لیکن بائبل میں ان دوسرے اہلِ ایمان کا کوئی ذکر نہیں جو نوحؑ کے خاندان کے علاوہ کشتی میں سوار تھے۔ درحقیقت کشتی کے مشمولات کے متعلق بائبل کے تین مختلف بیانات ہیں:

— یہووائی نسخے کے مطابق 'پاک' جانوروں اور پرندوں اور 'ناپاک' جانوروں میں امتیاز کیا گیا ہے' (سات[1] سات جوڑے یعنی سات نر اور سات مادہ 'پاک' قسم کے جانوروں کے کشتی میں لیے گئے اور 'ناپاک' قسم کے جانوروں کا صرف ایک ایک جوڑا لیا گیا)

— یہووائی نسخے کے ایک ترمیم شدہ فقرے (پیدائش ۷ : ۸) کے مطابق 'پاک' اور 'ناپاک' ہر قسم کے جانوروں کا صرف ایک ایک جوڑا کشتی میں لیا گیا تھا۔

— شاہی نسخے کے مطابق کشتی میں نوحؑ تھے۔ ان کا خاندان (بلا استثنا) تھا اور ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا۔

قرآن میں فی نفسہٖ طوفان کا حال سورۂ ہود (۱۱) کی آیات ۲۵ تا ۴۹ اور سورۂ مومنون (۲۳) کی آیات ۲۲ تا ۳۰ میں بیان کیا گیا ہے۔ بائبل اور قرآن کے بیانات میں کوئی اہم اختلاف نہیں۔

بائبل کے بیان کے مطابق کشتی کوہِ اراراط (پیدائش ۸ : ۴) پر جاکر ٹھہری تھی جب کہ قرآن میں اس کا نام جودی (۱۱ : ۴۴) دیا گیا ہے جودی آرمینیا میں کوہ اراراط کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ ان دونوں بیانات سے مطابقت دینے کے لیے لوگوں نے پہاڑوں کے نام تبدیل نہیں کیے۔ آر بلاشیر اس کی تصدیق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عرب میں ایک پہاڑ کی چوٹی کا نام جودی ہے۔ ہوسکتا

---

[1] یہاں 'سات' سے مراد یقیناً بہت سے جوڑے ہیں کیونکہ سامی زبانوں میں سات سے اکثر کثرت مراد ہوتی ہے۔ مصنف

ہے کہ ناموں کی یہ مطابقت مصنوعی ہو۔[2]

بائبل اور قرآن کے بیانات میں جو بڑے بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں' انھیں واضح طور پر بیان کیا جاسکتا ہے ان میں سے بعض کا تنقیدی جائزہ لینا ممکن نہیں کیونکہ معروضی کوائف و معلومات کا فقدان ہے۔ تاہم جہاں جہاں مسلمہ معلومات و تفصیلات کی روشنی میں بائبل

---

[2] جودی پہاڑ کردستان کے علاقے میں جزیرہ ابنِ عمر کے شمال مشرقی جانب واقع ہے۔ بائبل میں اس کشتی کے ٹھہرنے کی جگہ اراراط بتائی گئی ہے۔ جو ارمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک سلسلۂ کوہستان کا نام بھی۔ سلسلۂ کوہستان کے معنی میں جس کو اراراط کہتے ہیں وہ ارمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہوکر جنوب میں کردستان تک چلتا ہے اور جبل الجودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جودی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھہرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مسیحؑ سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیروسس (Berasus) نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں وہ کشتیِ نوح کے ٹھہرنے کا مقام جودی ہی بتاتا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیڈینوس (Abydenus) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے نیز وہ اپنے زمانے کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنھیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتے ہیں۔" (مولانا مودودی 'تفہیم القرآن جلد ۲' سورۂ ہود حاشہ نمبر ۴۶)

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی سیکڑوں سال پہلے کشتی کے ٹھہرنے کا مقام جودی تسلیم کیا جاتا تھا۔ بابلی اور یونانی مندرجات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن کا بیان سچا ہے۔ جیسا کہ خود فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ جودی کوہ اراراط کی سب سے اونچی چوٹی ہے اور قرینِ قیاس بھی یہی ہے کہ کشتی کوہِ اراراط کی سب سے اونچی چوٹی پر ٹھہری ہوگی۔ لہٰذا قرآن اور بائبل کے بیانوں میں عمومی اور خصوصی ناموں کے فرق کے سوا اور کوئی اختلاف نہیں۔ جزو اور کل کا سا فرق ہے۔ جزیرہ ابن عمر موصل (عراق) کے شمال میں واقع ہے

مفتی انتظام اللہ شہابی نے اپنی تصنیف "جغرافیہ قرآن" میں 'جودی' پر جو مختصر مقالہ دیا ہے اس میں مزید حوالے موجود ہیں۔ تورات کے موجودہ ترجمے میں صرف پہاڑ کا نام اراراط دیا گیا ہے مگر سریانی و کلدانی زبان میں تورات کے جو نسخے ہیں ان سب میں کشتیِ نوح کے ٹھہرنے کی جگہ کا نام کوہِ جودی ہے۔ مشہور مورخ اور جغرافیہ نویس یاقوت ی نے تورات کا جو لفظی ترجمہ اصلی زبان سے کیا تھا اس میں بھی جودی ہی ہے نیز دائرہ المعارف العربیہ کے عیسائی مصنفین کی بھی یہی متفقہ رائے ہے کہ کشتی جودی پہاڑ پر ہی ٹھہری تھی۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی ضد میں بائبل کے یہودی' عیسائی مترجمین نے صرف اراراط کر دیا۔ مترجم

کے بیانات کی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے۔ وقت اور مقام اور جغرافیائی حدود کے متعلق بائبل کی فراہم کردہ معلومات اور جدید انکشافات و معلومات کی باہمی عدم مطابقت بے حد واضح ہے۔ اس کے برعکس قرآن کے بیان میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جس پر معروضی نکتہ چینی کی جا سکے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ بائبل کے بیان اور قرآن کے بیان کے مابین جو بعد زمانی واقع ہوا ہے، اس میں انسان کو ایسی معلومات حاصل ہو گئی ہوں جن سے اس واقعے (طوفان) پر روشنی پڑتی ہو؟ اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ عہد نامۂ عتیق کے وقت سے لے کر نزولِ قرآن کے وقت تک انسان کے پاس صرف خود بائبل ہی ایک ایسی دستاویز تھی جس میں اس قدیم واقعے کا ذکر پایا جاتا تھا۔ اگر ان بیانات میں ایسی تبدیلیوں کے ذمہ دار انسان نہیں جنھوں نے ان کے مطلب و معنی کو جدید معلومات کے لحاظ سے متاثر کیا، تو ایک دوسری توجیہ قبول کرنی پڑے گی: یعنی بائبل کے بعد نازل ہونے والی وحی۔

۳۔ خروج

موسیٰؑ اور ان کے پیروؤں کا مصر سے خروج (کنعان کی طرف روانگی کا پہلا مرحلہ) ایک بڑا اہم واقعہ ہے۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ ہے اور اس کا سیاق و سباق معلوم ہے اگرچہ کہیں کہیں ایسے بیانات بھی ملتے ہیں جو اسے بڑی حد تک ایک فرضی و خرافاتی روایت بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

عہد نامۂ عتیق میں 'خروج' تورات کی دوسری کتاب ہے۔ اس میں صحرا کے سفر کے علاوہ موسیٰؑ کے کوہ سینا پر خدا سے عہد باندھنے کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔ قدرتی طور پر قرآن میں اسے بھی کافی جگہ دی گئی ہے۔ موسیٰؑ اور ان کے بھائی ہارونؑ کے فرعون سے مذاکرات اور کشمکش اور مصر سے کوچ کا حال دس سے زائد سورتوں میں طویل بیانات میں دیا گیا ہے مثلاً سورۂ اعراف (۷)، سورۂ یونس (۱۰)، سورۂ طٰہٰ (۲۰) اور سورۂ شعراء (۲۶)۔ ان کے علاوہ نسبتاً مختصر بیانات بھی ہیں بلکہ بعض سادہ سی یاد دہانیاں بھی۔ فرعون جو اس واقعہ میں مصر

کی جانب سے سب سے بڑا کردار ہے، اس کا نام (جہاں تک مجھے علم ہے) قرآن کی ستائیس سورتوں میں چوہتر دفعہ آیا ہے۔ یہاں قرآن اور بائبل کے بیانات کا مطالعہ خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہے کیونکہ طوفانِ نوح کے بارے میں ہم نے جو کچھ نوٹ کیا ہے، اس کے برعکس یہاں دونوں بیانات میں بہت سے نکات مشترک ہیں۔ یقیناً اختلافات بھی ہیں لیکن بائبل کے بیان کی خاصی تاریخی قدر و قیمت ہے جیسا کہ ہم دیکھیں گے۔ یہ اس لیے کہ اس سے ہمیں متعلقہ فرعون بلکہ دو فرعونوں کو شناخت کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جس مفروضے کا آغاز بائبل سے ہوتا ہے اس کی تکمیل قرآن میں دی گئی معلومات سے ہوتی ہے۔ ان دونوں آسمانی کتابوں میں دی گئی معلومات میں جدید معلومات میں انکشافات کا اضافہ کرنے اور بائبل، قرآن اور جدید علم کے باہم مقابلہ و موازنہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کتبِ مقدسہ میں دیے گئے اس واقعے کو تاریخی سیاق و سباق میں رکھا جا سکے۔

خروج کے متعلق بائبل کا بیان

بائبل کا بیان یہودیوں کے یعقوبؑ کے ساتھ مصر میں داخل ہونے سے شروع ہوتا ہے جہاں وہ یوسف سے جا کر مل گئے۔ بعد ازاں کتاب خروج (۱: ۸) کے مطابق:

"تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسفؑ کو نہیں جانتا تھا" اور یہودیوں پر ظلم و تشدد کا دور شروع ہو گیا۔ نئے فرعون نے یہودیوں کو حکم دیا کہ پتوم اور رعمسیس کے شہر تعمیر کریں (خروج ۱: ۱۱)۔ یہودیوں کی آبادی کو کنٹرول کرنے اور اسے بڑھنے سے روکنے کے لیے فرعون نے حکم جاری کیا کہ نیا پیدا ہونے والا ہر یہودی لڑکا دریا میں پھینک دیا جائے۔ تاہم موسیٰؑ کی ماں نے ان کی پیدائش کے تین ماہ تک انھیں چھپا بچا کر رکھا لیکن بالآخر سرکنڈوں کی ٹوکری میں ڈال کر دریا کے کنارے رکھ دیا۔ وہاں سے انھیں فرعون کی لڑکی نے اٹھا لیا اور پرورش کے لیے ایک دایہ کے حوالے کر دیا۔ یہ دایہ خود موسیٰؑ ہی کی ماں تھیں یہ اس لیے ہوا کہ موسیٰؑ کی بہن دیکھتی رہی تھیں کہ بچے کو کون پاتا اور اٹھاتا ہے۔ بہن نے ایسا ظاہر کیا کہ وہ بچے کو بالکل نہیں جانتیں۔ پھر انھوں نے موسیٰؑ کی پرورش کے لیے

شہزادی کو ایک مناسب دایہ کا پتہ بتایا جو دراصل موسیٰ کی والدہ تھیں۔ بچے کو فرعون کے لڑکوں کی طرح پالا پوسا گیا اور موسیٰ نام رکھا گیا۔

جوانی میں موسیٰ مصر چھوڑ کر مدین چلے گئے اور وہاں شادی کر کے ایک طویل عرصے تک رہے۔ کتابِ خروج (۲ : ۲۳) میں یہ اہم بیان ملتا ہے۔

"اور ایک مدت کے بعد یوں ہوا کہ مصر کا بادشاہ مر گیا۔"

خدا نے موسیٰؑ کو حکم دیا کہ مصر جا کر فرعون سے ملیں اور اپنے بھائیوں کو وہاں سے نکال لائیں (اس حکم کی تفصیل 'درخت تجلی' والے واقعے میں دی گئی ہے)۔ موسیٰؑ کے بھائی ہارونؑ نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ یہی وجہ ہے کہ مصر واپس آنے کے بعد موسیٰؑ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر فرعون کے پاس گئے۔ یہ فرعون اس فرعون کے بعد تخت نشین ہوا تھا جس کے دورِ حکومت میں بہت پہلے موسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔

فرعون نے یہودیوں کو موسیٰؑ کے ساتھ مصر سے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ ایک دفعہ پھر خدا موسیٰؑ پر ظاہر ہوا اور انھیں حکم دیا کہ فرعون کے پاس جا کر اپنی درخواست کا اعادہ کریں۔ بائبل کے بیان کے مطابق اس وقت موسیٰؑ کی عمر اسّی سال تھی۔ جادو[1] کے ذریعے موسیٰؑ نے فرعون پر ثابت کر دیا کہ وہ مافوق الفطرت قوتوں کے مالک ہیں لیکن فرعون کے نزدیک یہ کافی نہ تھا۔ تب خدا نے مصر پر مختلف عذاب نازل کیے۔ دریاؤں کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا سارے ملک پر لاتعداد مینڈکوں، مچھروں، مکھیوں، جوؤں نے حملہ کر دیا۔ مویشیوں میں مری پھیل گئی۔ آدمیوں اور جانوروں کے جسموں پر پھوڑے اور پھپھولے پیدا ہو گئے۔ اولوں کے طوفان برسے۔ ٹڈیاں قہر بن کر نازل ہوئیں۔ ملک میں اندھیرا چھا گیا اور پہلوٹھی کے بچے مر گئے ان سب کے باوجود بھی فرعون نے یہودیوں کو مصر سے نکل جانے کی اجازت نہ دی۔

اس لیے وہ شہر رعمیس سے نکلے۔ بال بچوں کو چھوڑ کر ان کی تعداد چھ لاکھ[2] تھی۔ (خروج ۱۲ : ۳۷)۔

---

[1] فاضل مصنف کا یہ بیان درست نہیں، موسیٰؑ جادوگر نہ تھے قرآن کی طرح بائبل بھی ان کے معجزوں کا ذکر کرتی ہے۔ مترجم

[2] ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہ تعداد مبالغہ آمیز ہے۔ مصنف

"تب فرعون نے اپنا رتھ تیار کروا دیا، اپنی فوج کو ساتھ لیا اور اس نے چھ سو چنے ہوئے رتھ بلکہ مصر کے سب رتھ لیے اور ان سبھوں میں سرداروں کو بٹھایا۔ . . . . مصر کے بادشاہ فرعون نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا کیونکہ بنی اسرائیل بڑے فخر سے نکلے تھے۔" (خروج ۱۴ : ۶، ۸) مصریوں نے موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کو سمندر کے کنارے جا لیا۔ موسیٰؑ نے اپنا عصا بلند کیا اور سمندر ان کے آگے پھٹ گیا۔ وہ اور ان کے پیرو اس میں سے اس طرح گزر گئے کہ ان کے پاؤں تک گیلے نہ ہوئے۔ "مصریوں نے ان کا تعاقب کیا اور فرعون کے سب گھوڑے اور رتھ اور سوار ان کے پیچھے پیچھے سمندر کے بیچ میں چلے گئے۔" (خروج ۱۴ : ۲۳)۔ "اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا، غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوڑا۔ پر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیوار کی طرح رہا۔" (خروج ۱۴ : ۲۸-۲۹)

کتابِ خروج کی عبارت بالکل واضح ہے۔ فرعون تعاقب کرنے والوں کا سربراہ تھا اور غرق ہو گیا کیونکہ 'خروج' کی متعلقہ عبارت یوں ہے کہ "ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا" علاوہ ازیں بائبل کی کتاب زبور میں اس کی تفصیل دہرائی گئی ہے۔ زبور کی مناجات ۱۰۶ کی آیت ۱۱ اور مناجات ۱۳۶ کی آیات ۱۳ اور ۱۵ میں خدا کا شکر ادا کیا گیا ہے جس نے "بحرِ قلزم کو دو حصے کر دیا . . . . . اور اسرائیل کو اس میں سے پار کیا . . . لیکن فرعون اور اس کے لشکر کو بحرِ قلزم میں ڈال دیا۔"

لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ بائبل کے مطابق 'خروج' والا فرعون سمندر میں غرق ہو گیا۔ بائبل یہ بیان نہیں کرتی کہ اس کے جسم کا کیا بنا؟

خروج کے متعلق قرآن کا بیان

قرآن میں خروج کا جو بیان ہے وہ موٹی موٹی باتوں میں بائبل کے بیان سے ملتا جلتا ہے۔ تاہم اسے نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ پوری کتاب (قرآن)

میں جگہ جگہ منتشر عبارتوں پر مشتمل ہے۔

خروج کے وقت جو فرعون حکمران تھا نہ تو بائبل ہی اس کا نام دیتی ہے اور نہ قرآن جس سے اس کی شناخت ہو سکتی۔ قرآن کے بیان سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مشیروں، صلاح کاروں میں سے ایک کا نام ہامان تھا۔ قرآن میں اس کا ذکر چھ دفعہ آیا ہے (۲۸: ۶، ۸، ۳۸ اور ۲۹: ۳۹ نیز ۴۰: ۲۴، ۲۶)۔

فرعون یہودیوں پر ظلم و جبر کرتا ہے:

سورۂ ابراہیم (۱۴) آیت ۶:

"اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا نے تم پر جو مہربانیاں کی ہیں ان کو یاد کرو جب کہ تم کو فرعون کی قوم سے نجات دلائی۔ وہ لوگ تمھیں بڑے عذاب دیتے تھے اور تمھارے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے"

اس ظلم و جور کا ذکر انہی الفاظ میں سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۴۱ میں بھی کیا گیا ہے لیکن بائبل کے برعکس قرآن ان شہروں کے نام نہیں دیتا جو اپنی غلامی کے دور میں یہودیوں نے تعمیر کیے تھے۔

موسیٰؑ کو دریا کے کنارے چھوڑ دینے کا واقعہ سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیات ۳۹-۴۰ اور سورہ قصص (۲۸) کی آیات ۷ تا ۱۳ میں بیان کیا گیا ہے۔[1]

قرآن کے بیان کے مطابق موسیٰؑ کو فرعون کے خاندان والوں نے اٹھالیا اور اپنالیا۔

---

[1] بائبل کا بیان ہے کہ موسیٰ کی ماں نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا لیا اور اس پر چکنی مٹی اور رال لگا کر لڑکے کو اس میں رکھا اور اسے دریا کے کنارے جھاؤ میں چھوڑ آئی"۔ اس کے برعکس قرآن کا کہنا ہے کہ اللہ نے موسیٰؑ کی ماں کے دل میں ڈالا کہ "اسے (موسیٰؑ کو) صندوق میں رکھو پھر اس صندوق کو دریا میں ڈال دو تو دریا اس کو کنارے پر ڈال دے گا"۔ قرآن کا بیان صحیح اور قرین قیاس ہے کیونکہ فرعون کی بیٹی (اگرچہ قرآن کا اس سے بھی اختلاف ہے اور وہ فرعون کے گھر والوں کا ذکر کرتا ہے) یہودیوں کی بستی کے پاس تو دریا کے کنارے نہیں کر رہی ہو گی جہاں سے اس نے موسیٰؑ کو اٹھایا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے شاہی محل

سورۂ قصص (۲۸) کی آیات ۸-۹ میں ہے:-

"فرعون کے لوگوں نے اس کو اٹھا لیا اس لیے کہ (نتیجہ یہ ہونا تھا کہ) وہ ان کا دشمن اور ان کے لیے موجب غم ہو۔ بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر چوک گئے۔ اور فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ میری اور تمھاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو قتل نہ کرنا شاید یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور وہ انجام سے بے خبر تھے"

اسلامی روایات کے مطابق فرعون کی بیوی نے موسیٰؑ کی غور و پرداخت کی۔ قرآن کے مطابق موسیٰؑ کو فرعون کی بیوی نے نہیں پایا تھا بلکہ اس کے گھر کے افراد نے۔

موسیٰؑ کی جوانی، قیام مدین اور شادی کا حال سورۂ قصص (۲۸) کی آیات ۱۳ تا ۲۸ میں بیان کیا گیا ہے۔

خاص کر درختِ تجلی (Burning Bush) کے واقعے کا ذکر سورۂ طٰہٰ (۲۰) کے ابتدائی حصے اور سورۂ قصص (۲۸) کی آیات ۳۰ تا ۳۵ میں کیا گیا ہے۔

قہرالٰہی کے طور پر جو دس بلائیں، وبائیں مصر پر نازل کی گئیں بائبل میں ان کا طویل اور مفصل ذکر ہے لیکن قرآن صرف پانچ کا مختصر ذکر کرتا ہے (۷: ۱۳۳)۔ اور وہ ہیں سیلاب ٹڈی دل،

(بقیہ حاشیہ) کے قرب و جوار ہی میں مصروف سیر ہو گی اور موسیٰؑ کا صندوق دریا میں بہتے بہتے وہاں تک پہنچا ہو گا اور دریا نے کنارے پر ڈال دیا ہو گا جہاں سے 'فرعون کی بیٹی' کے حکم سے خادموں نے اٹھایا ہو گا۔ اس اثنا میں بہتے ہوئے صندوق کے ساتھ ساتھ موسیٰؑ کی بہن بھی دریا کے کنارے کنارے چلتی رہی ہو گی تاکہ یہ دیکھے کیا پیش آتا ہے۔ بعد میں موسیٰؑ کی شہزادوں کی طرح پرورش بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ صندوق کو فرعون کی ملکہ کے حکم سے اس کے اہلِ خانہ نے اٹھایا اور اس نے موسیٰؑ کو بیٹا بنانے کی خواہش ظاہر کی جسے فرعون نے قبول کر لیا۔ فرعون کی بیٹی غالباً ایسا نہ کر سکی۔

پھر بائبل کی 'سرکنڈوں کی ٹوکری' اور قرآن کے 'تابوت' (صندوق) میں بھی بڑا فرق ہے۔ تین ماہ کے بچے کو دریا میں ڈالنے کے لیے صندوق کہیں زیادہ محفوظ ہے۔ البتہ صرف کنارے پر رکھ دینے کے لیے ٹوکری کام دے سکتی تھی۔ مترجم

جوئیں، مینڈک اور خون۔

قرآن میں بنی اسرائیل کے مصر سے فرار کا حال تو بیان کیا گیا ہے لیکن وہ جغرافیائی کوائف و معلومات نہیں دیے گئے جو بائبل میں دیے گئے ہیں اور نہ بنی اسرائیل کی اس ناقابلِ یقین تعداد کا ذکر ہے جو بائبل میں دی گئی ہے۔ اگرچہ بائبل ہمیں یقین دلاتی ہے لیکن یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ چھ لاکھ مرد اپنی بیویوں اور بچوں سمیت ایک طویل عرصے تک صحرا میں زندگی گزارتے رہے۔

فرعون کی موت کا حال سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۷۸ میں اس طرح کیا گیا ہے:

"پھر فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا تو دریا (کی موجوں) نے ان پر چڑھ کر انھیں ڈھانک لیا۔"

یہودی بچ گئے۔ فرعون غرق ہو گیا لیکن اس کی لاش مل گئی۔ لاش مل گئی۔ لاش کا مل جانا ایک بہت اہم بات ہے لیکن بائبل اس کے بارے میں خاموش ہے۔

قرآن کی سورۂ یونس (۱۰) کی آیات ۹۰ تا ۹۲ میں خدا بول رہا ہے:

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا تو فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور تعدی سے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ جب اس کو غرق (کے عذاب) نے آ پکڑا تو کہنے لگا میں ایمان لایا کہ جس (خدا) پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں فرمانبرداروں میں ہوں (جواب ملا کہ) اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مفسد بنا رہا؟ تو آج ہم تیرے بدن کو (سمندر سے) نکال لیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لیے عبرت ہو اور بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔"

اس عبارت میں دو باتیں تشریح طلب ہیں:

(ا) جس نافرمانی اور فساد کا یہاں ذکر ہے اسے حضرت موسیٰؑ کی ان مساعی کی روشنی میں سمجھنا چاہیے جو انھوں نے فرعون کو سیدھی راہ پر لانے کے لیے کیں۔

(ب) فرعون کے بدن کو سمندر سے نکال لینے سے مراد اس کی لاش ہے کیونکہ سورۂ

ہود (۱۱) کی آیت ۹۸ میں وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ فرعون اور اس کے پیرو لعنت (بدی) اور خلود فی النار کے مستحق ٹھہرے:

"وہ (فرعون) قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا اور ان کو دوزخ میں جا اتارے گا اور جس مقام پر وہ اتارے جائیں گے وہ برا ہے۔"

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ جن واقعات و امور کی تاریخی، جغرافیائی اور عصری کوائف و معلومات سے جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے، ان کے متعلق حسبِ ذیل نکات پر قرآن اور بائبل کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

۔ موسیٰؑ کی جماعت کے یہودیوں نے جو شہر تعمیر کیے اور خروج کے وقت انھوں نے جو راستہ اختیار کیا اور اس راستے پر جو شہر اور مقامات آئے، قرآن ان کے نام نہیں دیتا۔

۔ موسیٰؑ کے قیامِ مدین کے دوران میں فرعون کی موت واقع ہونے کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں۔

۔ جب موسیٰؑ پیغمبرانہ مشن کے ساتھ فرعون کے پاس گئے اور اسے خطاب کیا تو ان کی عمر کیا تھی؟ قرآن اس کے متعلق خاموش ہے۔

۔ قرآن میں موسیٰؑ کے پیروؤں کی گنتی نہیں ملتی۔ بائبل میں ان کی تعداد کو ناقابلِ یقین حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے (چھ لاکھ مرد اور ان کے بیوی بچے مزید براں یعنی بیس لاکھ سے زائد انسانوں کی جماعت!)

۔ بائبل میں فرعون کی موت کے بعد اس کی لاش کے بچ رہنے کا کوئی ذکر نہیں۔

ہمارے مقاصد کے لیے قرآن اور بائبل کے مشترکہ نکات حسبِ ذیل ہیں:

۔ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے کہ موسیٰؑ کے پیرو یہودیوں پر فرعون کی طرف سے ظلم و تشدد ہوتا رہا تھا۔

۔ بائبل اور قرآن دونوں شاہِ مصر کے نام کے متعلق خاموش ہیں۔

۔ قرآن تصدیق کرتا ہے کہ خروج کے دوران میں فرعون کی موت واقع ہوئی۔

بائبل اور قرآن دونوں شاہ مصر کے نام کے متعلق خاموش ہیں

بنی اسرائیل مصر میں کتنی مدت رہے اور وہاں سے کس طرح نکلے؟ اس بارے میں بائبل اور قرآن کے بیانات سے جو مواد فراہم ہوتا ہے' اس میں اور جدید معلومات میں باہمی ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ درحقیقت ان کے باہمی توازن میں بڑی ناہمواری پائی جاتی ہے کیونکہ بعض کوائف و معلومات سے مسائل پیدا ہوتے ہیں جب کہ دوسری کسی بحث کا موضوع ہی نہیں بن سکیں۔

۱۔ بیانات میں پائی جانیوالی بعض تفصیلات کا غائر معائنہ

مصر میں یہودی

یہ کہا جا سکتا ہے اور اس میں غلطی کا زیادہ امکان بھی نہیں کہ بائبل کے مطابق یہودی مصر میں چار سو سال (کتاب پیدائش ۱۵: ۱۳) یا چار سو تیس سال (کتاب خروج ۱۲: ۴۰) رہے کتاب پیدائش اور کتاب خروج کے اس اختلاف کے باوجود — اور یہ اختلاف کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا — یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصر میں یہودیوں کے قیام کا دور ابراہیمؑ کے بہت بعد اس وقت شروع ہوا جب یعقوبؑ کے بیٹے یوسفؑ[1] مصر پہنچے اور پھر انھوں نے اپنے بھائیوں کو ان کے کنبوں سمیت وہاں بلا لیا۔ یہ تفصیلات بائبل میں ملتی ہیں اور قرآن بھی اولادِ یعقوبؑ کے مصر میں جا کر آباد ہونے کا ذکر کرتا ہے لیکن اس نقل و حرکت کی تاریخوں کا تعین نہیں کرتا۔ بائبل اور قرآن کے علاوہ ہمیں کوئی اور دستاویز میسر نہیں جو اس پر روشنی ڈالے۔

---

[1] حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ حضرت ابراہیمؑ کے بالترتیب پوتے اور پڑپوتے تھے۔ مترجم

پی مانٹے (P. Montel) سے لے کر ڈینیل روپس (Daniel Rops) تک تمام جدید شارحین کا خیال ہے کہ یوسفؑ اور برادرانِ یوسف کی مصر میں آمد اسی زمانے میں ہوئی جب سترہویں صدی قبلِ مسیح میں ہکسوس خاندان مصر کی حکومت پر قابض ہوا اور غالباً کسی ہکسوس بادشاہ نے اولادِ یعقوبؑ کو نیل کے ڈیلٹا میں ادریس کے مقام پر حسنِ سلوک کے ساتھ آباد کیا[1]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مندرجہ بالا قیاس آرائی اور بائبل (سلاطین ۱، ۶: ۱) کے بیان میں صاف تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ بائبل کے مطابق مصر سے خروج کا واقعہ ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر (۹۷۱ قبلِ مسیح کے لگ بھگ) سے چار سو اسّی سال پہلے پیش آیا یعنی

---

[1] جس زمانے میں حضرت یوسفؑ مصر پہنچے وہاں مصری تاریخ کا پندرھواں خاندان حکمران تھا۔ اسے ہکسوس یعنی چرواہوں کا خاندان کہتے ہیں۔ عرب مورخوں اور مفسروں نے انھیں 'عمالیق' کہا ہے۔ یہ خاندان فلسطین و شام کے عربوں میں سے تھا اور مسیحؑ سے تقریباً دو ہزار سال پہلے مصر پر قابض ہو گیا تھا اور اہلِ مصر کے لیے بیرونی حملہ آوروں کی حیثیت رکھتا تھا چونکہ حضرت یوسفؑ اور ان کے اہلِ خاندان بھی فلسطین سے آئے تھے اس لیے قدرتی طور پر شاہانِ وقت کو ان سے ہمدردی تھی اور ان کی خوب پذیرائی کی گئی اور حضرت یوسفؑ کو اپنے پیغمبرانہ اوصاف اور مدبرانہ کارروائیوں سے عروج حاصل ہوا۔ ہکسوس خاندان (عمالقہ) پندرھویں صدی قبلِ مسیح تک مصر پر قابض رہا۔ اس کے بعد ایک نہایت متعصب قدیم مصری قبطی خاندان نے غلبہ و اقتدار حاصل کر لیا۔ اس نے عمالقہ کو ملک سے نکال باہر کیا اور ان کے ہم نسل اور رفیق بنی اسرائیل پر ظلم و تشدد شروع کر دیا۔

چرواہے بادشاہوں (عمالقہ) کا اپنا الگ مذہب تھا اور وہ مصری مذہب کے پیرو نہ تھے چونکہ فرعون (سورج کا بیٹا یعنی سورج بنسی) اہلِ مصر کی مذہبی اصطلاح تھی' اس لیے چرواہے بادشاہ فرعون نہیں کہلاتے تھے فرعون کا لقب مصر کے 'فرزندِ زمین' بادشاہوں کے لیے مخصوص تھا۔ اسی لیے قرآن حضرت یوسف کے ہمعصر چرواہے بادشاہ کو فرعون کے نام سے یاد نہیں کرتا البتہ حضرت موسیٰؑ کے پرورش کنندہ (رعمیس دوم) اور اس کے جانشین بادشاہ (منفتاح) کو فرعون کہتا ہے کیونکہ وہ خالص 'فرزندِ زمین' قبطی النسل تھے لیکن بائبل حضرت یوسفؑ کے ہمعصر چرواہے بادشاہ کو بھی فرعون کا نام دیتی ہے جو غلط ہے۔ عصرِ جدید کے محققوں کی رائے ہے کہ 'چرواہے بادشاہوں' میں سے جسے مصری تاریخ میں (Apophis ابوفیس) کہا جاتا ہے' وہی حضرت یوسفؑ کا ہمعصر اور سرپرست تھا۔ مترجم

تقریباً ۱۴۵۰ قبل مسیح میں۔ اس حساب کی رو سے مصر میں بنی اسرائیل کا داخلہ ۱۸۵۰-۱۸۸۰ قبل مسیح کے لگ بھگ ہوا۔[1] لیکن یہ تو ٹھیک وہی زمانہ ہے جو حضرت ابراہیم کا زمانہ فرض کیا جاتا ہے۔ بائبل میں مندرج دوسرے احوال و کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف کے درمیان ڈھائی سو سال کا بعد زمانی تھا۔ لہٰذا بائبل کی کتاب 'سلاطین ۱' کی یہ عبارت تاریخی نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں۔[2]

جو نظریہ یہاں پیش کیا گیا ہے اس پر صرف یہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو کتاب سلاطین ۱ سے لیا گیا ہے۔ لیکن ان تاریخی واقعات و کوائف کی واضح نادرستی اس اعتراض کو غیر موثر اور بے قدر و قیمت کر دیتی ہے۔

کتبِ مقدسہ سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں نے اپنے قیامِ مصر کے بہت ہی دھندلے آثار چھوڑے ہیں۔ تاہم متعدد ہیروغلیفی دستاویزات سے مصر میں مزدوروں کاریگروں کی ایک نوع کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے جنھیں 'عپرو'، 'ہپرو' یا 'ہبیرو' کہتے تھے اور جنھیں غلط یا صحیح طور پر 'ہیبریو' یعنی عبرانی (Hebrew) کی حیثیت سے شناخت کیا گیا ہے یعنی اسرائیلی، یہودی۔ ان میں تعمیر کا کام کرنے والے راج مزدور، زرعی مزدور اور فصل کاٹنے والے مزدور وغیرہ شامل تھے۔ لیکن وہ آئے کہاں سے تھے؟ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ فادر ڈی واکس ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہے:

"یہ لوگ مقامی آبادی کا حصہ نہیں اور معاشرے کے کسی طبقے میں بھی کامل طور پر گھلتے ملتے نہیں۔ پیشے اور رتبے کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں۔"

---

[1] پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ بائبل کے مطابق بنی اسرائیل ۴۰۰ یا ۴۳۰ سال مصر میں رہے۔ خروج کے سال ۱۴۵۰ میں ۴۰۰ سال یا ۴۳۰ سال جمع کرنے سے داخلے کا سن ۱۸۵۰ یا ۱۸۸۰ قبل مسیح آتا ہے۔ مترجم

[2] جب بعد میں ہم کتابِ سلاطین کی اس عبارت کی جانچ پرکھ کے لیے فادر ڈی واکس سے رجوع کریں گے تو اس موضوع پر مزید بحث کی جائے گی۔ مصنف

ٹوتھ موسس (Tuthmosis) سوم کے زمانے کے ایک پیپرس مخطوطے میں ان کا ذکر "اصطبلوں میں کام کرنے والے مزدوروں" کی حیثیت سے آیا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ پندرھویں صدی قبل مسیح میں ایمنوفس دوم (Amenophis) اس نسل کے تین ہزار چھ سو قیدی کنعان سے لایا تھا کیونکہ فادر ڈی واکس کے بقول شامی۔ فلسطینی آبادی کا ایک خاصا بڑا حصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا۔ سن ۱۳۰۰ قبلِ مسیح کے لگ بھگ سیتھوس اول (Sethos) کے زمانے میں 'ہیپرو' نے کنعان کے علاقے بیت شان میں خاصی گڑبڑ اور شورش پیدا کی اور رعمیس دوم کے عہد حکومت میں ان میں سے کچھ لوگ پتھر کی کانوں میں کام کرتے تھے یا فرعون کی عمارتوں کے لیے بھاری شہتیر، کھمبے وغیرہ ڈھونے پر مقرر تھے۔ بائبل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رعمیس دوم کے عہد میں عبرانیوں (یہودیوں) کو شمالی دارالحکومت شہر رعمیس کی تعمیر پر لگایا گیا تھا۔ مصری تحریروں میں 'عپیرو' کا ذکر پھر بارہویں صدی قبلِ مسیح میں آتا ہے اور آخری دفعہ رعمیس سوم کے عہد میں۔

مصری نوشتوں میں 'عپیرو' کا یونہی ذکر نہیں آتا۔ تو کیا اس لفظ کا اطلاق صرف عبرانیوں پر ہوتا تھا؟ اس بات کو ذہن میں رکھنا شائد قرینِ دانش ہوگا کہ ممکن ہے کہ یہ لفظ ابتدا میں 'جبری مزدوروں' کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور ایسا کرتے وقت ان کی 'اصل' نسل وغیرہ کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو لیکن بعد میں یہ لفظ کسی شخص کے پیشے کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بطور صفت استعمال کیا جانے لگا ہو۔ بعینہٖ جس طرح کہ لفظ 'سوئس' (Suisse - Swiss) کے فرانسیسی زبان میں متعدد معنی ہیں۔ اس سے مراد سوئٹزرلینڈ کا باشندہ بھی ہو سکتی ہے، قدیم فرانسیسی شہنشاہی دور کا بھاڑے کا فوجی سپاہی بھی جو سوئس نسل کا ہوتا تھا، ایک ویٹی کانی محافظ بھی اور عیسائی کلیسا کا ایک ملازم بھی۔۔۔

حقیقت حال جو کچھ بھی ہو، رعمیس دوم کے عہد حکومت میں عبرانیوں (بائبل کے بیان کے مطابق) یا 'عپیرو' (ہیروغلیفی نوشتوں کے مطابق) نے فرعون کی عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر میں حصہ لیا اور یہ فی الواقع جبری مشقت تھی۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رعمیس دوم یہودیوں پر ظلم و تشدد کرتا تھا۔ رعمیس اور پتوم کے شہر جن کا ذکر

کتاب خروج میں آیا ہے، نیل کے ڈیلٹا کے مشرقی حصے میں واقع ہیں۔ موجودہ شہر تانیس اور قنطیر بھی جو ایک دوسرے سے تقریباً پندرہ میل دور ہیں، اسی خطے میں واقع ہیں۔ رعیمس کا تعمیر کردہ شمالی دارالحکومت وہیں واقع تھا۔ رعیمس دوم فرعون ہے جو یہودیوں پر ظلم و تشدد کرتا تھا۔

حضرت موسیٰؑ اس ماحول میں پیدا ہوئے جن حالات میں وہ دریائے نیل سے بچائے گئے، ان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ان کا نام بھی مصری ہے۔ پی مانٹے نے اپنی تصنیف 'مصر اور بائبل' (Egypt and Bible)[1] میں یہ واضح کیا ہے کہ 'مسو' (Mesw) یا میسی (Mesu) کے اسماء ہیروغلیفی زبان کی لغات مصنفہ رینکے (Ranke) میں دی گئی ذاتی ناموں کی فہرست میں شامل ہیں۔ قرآن نے موسیٰؑ کا نام ہو بہو یہیں سے لیا ہے۔

مصر کے عذاب

اس عنوان کے تحت بائبل میں دس سزاؤں، وباؤں، عذابوں کا ذکر کیا گیا ہے جو خدا نے مصر پر نازل کیے اور ہر 'عذاب' کی تفصیلات دی گئی ہیں جن سے مافوق الفطرت خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔ قرآن صرف پانچ عذابوں کا ذکر کرتا ہے جو اکثر و بیشتر قدرتی مظاہر کی نارمل حدود سے بڑھی ہوئی صورتیں ہیں یعنی سیلاب، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈک اور خون۔

ٹڈیوں اور مینڈکوں کی تعداد میں سرعت سے چند در چند اضافہ کا حال بائبل میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں دریا کے پانی کا خون میں تبدیل ہو جانے کا بھی ذکر ہے جو پوری سرزمین میں سیلاب کی شکل میں پھیل جاتا ہے۔ قرآن بھی خون کا ذکر کرتا ہے لیکن اس کی تفصیلات نہیں دیتا۔ اس موضوع پر قسم قسم کے مفروضے قائم کیے جا سکتے ہیں۔

بائبل میں دوسرے عذابوں (مچھروں، مکھیوں، پھوڑوں، اولوں، تاریکی، پہلوٹھی کے اور مویشیوں کی ہلاکت) کا ذکر ہے، طوفانِ نوح کی طرح ان کے ماخذ اور سرچشمے مختلف

---

[1] اصل فرانسیسی نام 'L'Egypte et la Bible' ہے۔

ہیں۔ مختلف ماخذ سے عبارتیں لے کر اور باہم جوڑ کر انھیں مرتب کیا گیا ہے۔

خروج کا راستہ

قرآن میں اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا لیکن بائبل میں اس کا بہت مفصل حال بیان کیا گیا ہے۔ فادر ڈی واکس اور پی مانٹے نے از سرِ نو مطالعہ و تحقیق کا کام شروع کیا ہے۔ غالباً سفرِ خروج کا آغاز تانس۔ قنطیر کے علاقے سے ہوا لیکن بقیہ راستے کے کوئی آثار نہیں ملے جس سے بائبل کے بیان کی تصدیق ہو سکتی۔ نہ وثوق سے یہ کہنا ممکن ہے کہ ٹھیک ٹھیک کس مقام پر سمندر کا پانی پھٹ کر موسیٰؑ اور ان کے پیروؤں کے لیے گزرگاہ بنی۔

سمندر کے پانی کا معجزانہ طریقے سے پھٹ جانا

بعض شارحین نے یہ تصور کر لیا ہے کہ شاید کسی دور دراز مقام پر کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹا ہوگا جس سے زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور دوسرے فلکی تغیرات واقع ہوئے اور سمندر میں ایک عظیم جوار بھاٹا کی کیفیت ظہور میں آئی۔ یہودیوں نے پیچھے ہٹتے ہوئے سمندر یعنی بھاٹا کے عالم سے فائدہ اٹھایا ہوگا جب کہ مصری، جو بے تحاشہ ان کا تعاقب کر رہے تھے، سمندر کے لوٹتے ہوئے (پانیوں (جوار) میں ڈوب کر فنا ہو گئے۔ لیکن یہ سب ایک مفروضہ بلکہ قیاس آرائی ہے۔

۲۔ تاریخ فراعنہ میں زمانہ خروج کا یقین

خروج کے واقعے کا زمانی تعین کرنے کے لیے نسبتاً زیادہ قطعی شہادت فراہم ہو سکتی ہے ایک طویل عرصے تک رعیمس دوم کے جانشین منفتاح کو خروج کے زمانے کا فرعون تصور کیا جاتا رہا۔ موجودہ صدی کے آغاز کے مشہور ماہر مصریات ماسپرو (Maspero) نے اپنی تصنیف "قاہرہ کے عجائب گھر کی سیر کرنے والوں کی رہنما کتاب"

(visitors' guid the cairo museum) میں سنہ ۱۹۰۰ء میں لکھا تھا کہ[3] اسکندریہ کی روایت کے مطابق غالباً منفتاح ہی وہ فرعون تھا جس کے عہد میں خروج واقع ہوا اور جو سمندر میں ڈوب کر ہلاک[4] ہوا" میری دسترس ان دستاویز تک نہیں ہو سکی جن کی بنیاد پر ماسپیرو نے یہ دعویٰ کیا۔ لیکن بائبل کے اس شارح کے بلند مرتبے کا تقاضا ہے کہ ہم اس کے دعوے کو انتہائی اہمیت دیں۔

پی مانٹے کو چھوڑ کر بہت ہی کم ماہرین مصریات یا بائبل کی تفسیر و تشریح کے ماہرین ایسے ہیں جنھوں نے اس مفروضے کی حمایت یا مخالفت میں پیش کیے جانے والے دلائل کے بارے میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہو۔ تاہم گزشتہ چند دہوں میں مختلف مفروضوں کی بھرما ہوئی ہے جن کا واحد مقصد یہ ہے کہ بائبل کے بیانات کی ایک تفصیل سے اتفاق کا جواز پیدا کیا جائے۔ اگرچہ ان مفروضات کو وضع کرنے والے کتب مقدسہ کے دوسرے پہلوؤں پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ ایسا کوئی مفروضہ اچانک ظہور میں آجائے جو بائبل کے بیان کے ایک پہلو سے متفق اور ہم آہنگ ہو اگرچہ اس کے وضع کرنے والے نے کتب مقدسہ میں پائی جانے والی تمام دوسری معلومات اور کوائف سے اس کا مقابلہ و موازنہ کرنے کی زحمت گوارا نہ کی ہو (اور صرف بائبل سے بھی مقابلہ نہ کیا ہو) اور نہ تاریخ اور اثریات وغیرہ کی فراہم کردہ معلومات و کوائف سے اس کا مقابلہ کرنے کی پرواہ کی ہو!

ایک بہت ہی عجیب مفروضہ ہے۔ ڈی میلی (J. de Miceli) نے سنہ ۱۹۶۰ء میں پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ خروج کا واقعہ ۹۔ اپریل ۱۴۹۵ء قبلِ مسیح میں پیش آیا۔ اس نے اپنی معلومات کے لیے سراسر تقویمی حسابات پر انحصار کیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خروج کے وقت تھموسیس دوم (Tuthmosis) حکمران تھا اور اس لیے خروج کا فرعون وہی ہے اس مفروضے کی تائید و تصدیق کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ تھموسیس دوم کی ممی سے اس کی جلد پر فاسد تغیرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس شارح کے بقول یہ فاسد تغیرات کوڑھ کی وجہ سے ہیں کیونکہ بائبل میں مصر پر نازل ہونے والے جن عذابوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک جسموں پر پھوڑوں پھپھولوں کا پیدا ہو جانا بھی تھا۔ اس چکرا دینے والے دعوے میں بائبل

میں بیان کردہ دوسرے واقعات و حقائق کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے خاص کر بائبل میں شہر رعمیس کا ذکر جس کی بنا پر "رعمیس" کی حکومت سے پہلے خروج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک تھموسیس دوم کی جلد پر پائے جانے والے فاسد تغیرات، نشانات وغیرہ کا تعلق ہے ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مصر کا یہی بادشاہ خروج کے وقت کا فرعون تھا کیونکہ اس کے بیٹے تھموسیس سوم اور اس کے پوتے ایمنوفیس کی ممیوں سے بھی ان کی جلدوں پر رسولیوں کے نشان ظاہر ہوتے ہیں[1]۔ اسی بنا پر بعض شارحین کا خیال ہے کہ یہ فرعون کسی خاندانی جلدی بیماری میں مبتلا تھے۔ لہٰذا تھموسیس دوم کے فرعونِ خروج ہونے کا نظریہ قابلِ تسلیم نہیں۔

ڈینیل روپس نے اپنی کتاب "دی پیپل آف دی بائبل"[2] (اصحاب بائبل) میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایمنوفیس دوم کو خروج کا فرعون قرار دیتا ہے۔ یہ مفروضہ بھی مذکورہ بالا مفروضے سے مضبوط تر بنیاد پر قائم نہیں کیا گیا۔ چونکہ ایمنوفیس دوم کا باپ تھموسیس سوم بہت زیادہ قوم پرست واقع ہوا تھا لہٰذا اس امر واقعہ کی بنا پر ڈینیل روپس اعلان کرتا ہے کہ فرعون ایمنوفیس دوم ہی یہودیوں پر ظلم و تشدد کرنے والا فرعون تھا جب کہ اس کی سوتیلی ماں مشہور و معروف ملکہ ہتشپسوت (Hatshe-psut) نے موسیٰؑ کو دریا سے نکال کر اپنایا تھا۔

فا۔ ڈی واکس کا نظریہ کہ یہ فرعون رعمیس دوم تھا، نسبتاً قدرے ٹھوس بنیاد رکھتا ہے وہ اپنی تصنیف "دی اینسنٹ ہسٹری آف اسرائیل" (قدیم تاریخِ اسرائیل)[3] میں اپنے دعوے کو کھول کر اور بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اگر اس کا نظریہ بائبل کے بیان کے تمام نکات سے

---

[1] قاہرہ کے عجائب گھر میں ان فرعونوں کی جو ممیاں محفوظ ہیں ان پر یہ نشان صاف صاف نظر آتے ہیں۔ مصنف

[2] پیرس سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔

[3] پیرس سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی

سے متفق نہ بھی ہو تو بھی کم سے کم اس سے ایک بے حد اہم شہادت سامنے آتی ہے اور وہ ہے رعمیس اور پتوم کے شہروں کی تعمیر جو رعمیس دوم کے دور حکومت میں تعمیر کئے گئے اور جن کا حوالہ بائبل میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ دعویٰ قابلِ تسلیم نہیں کہ خروج کا واقعہ رعمیس دوم کی تخت نشینی سے پہلے پیش آیا۔ ڈرایوٹن اور وانڈیر کے مرتبہ تاریخ وار سلسلۂ واقعات کے مطابق رعمیس دوم ۱۳۰۱ء قبلِ مسیح میں تخت نشین ہوا لیکن روٹن کے مرتبہ تاریخی نقشۂ واقعات کے مطابق ۱۲۹۰ء قبل مسیح میں۔ جو دوسرے دو مفروضے اوپر بیان کئے گئے ہیں وہ اس نہایت اہم حقیقت الامر کی کی وجہ سے قرین عقل نہیں کہ بائبل کے مطابق رعمیس دوم ہی وہ فرعون ہے جس نے بنی اسرائیل پر ظلم و تشدد کا آغاز کیا۔

فادر ڈی واکس کا خیال ہے کہ خروج کا واقعہ رعمیس دوم کے عہدِ حکومت کے نصف اوّل یا وسط میں پیش آیا۔ لہٰذا وہ خروج کے واقعے کی صحیح تاریخ نہیں دیتا۔ وہ یہ عرصہ اس لیے تجویز کرتا ہے تاکہ موسیٰؑ اور ان کے پیروؤں کو کنعان میں سکونت پذیر ہونے کے لیے وقت مل جائے اور رعمیس دوم کا جانشین منفتاح (Mernaptah) جس نے اپنے باپ کی موت کے بعد سرحدی شورشوں کو دبایا تھا، بنی اسرائیل کو بھی دبا سکے جیسا کہ اس کے عہد حکومت کے پانچویں سال کے ایک غلیفی کتبے دار ستون میں دکھایا گیا ہے؟

اس نظریئے کے خلاف دو باتیں ہیں :۔

(ا) بائبل کے بیان (خروج ۲: ۲۳) سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب موسیٰؑ مدین میں تھے تو مصر کا بادشاہ مر گیا تھا۔ کتابِ خروج میں اس مصری بادشاہ کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ اس نے عبرانیوں (یہودیوں) سے جبری مشقت اور بیگار کے ذریعے رعمیس اور پتوم کے شہر تعمیر کرائے۔ یہ بادشاہ رعمیس دوم تھا۔ لہٰذا خروج کا واقعہ اس کے جانشین کے عہد ہی میں پیش آسکتا تھا۔ لیکن فادر ڈی واکس کتابِ خروج کے باب دوم کی تیسویں آیت کے بائبلی ماٰخذ کو شک و شبے کی نظر سے دیکھتا ہے۔

(ب) اس سے بھی زیادہ ہکا بکا کر دینے والی یہ بات ہے کہ یروشلم کے بائبلی اسکول کے ناظم کی حیثیت سے فادر ڈی واکس اپنے نظریۂ خروج میں بائبل کی دو اہم عبارتوں کا

حوالہ نہیں دیتا اور ان دونوں عبارتوں سے یہ شہادت ملتی ہے کہ فرار ہوتے ہوئے یہودیوں کے تعاقب کے دوران میں اس بادشاہ کو موت آئی۔ اندریں صورت یہ ممکن نہیں رہتا کہ ایک بادشاہ کے عہد حکومت کے خاتمے کے علاوہ خروج کسی دوسرے وقت پر واقع ہوا ہو۔

یہاں اس بات کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ خروج کے نتیجے میں فرعون کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس بارے میں 'کتاب خروج' کا تیرھواں اور چودھواں باب بالکل قطعی اور واضح ہیں:

"تب اس نے اپنا رتھ تیار کرایا اور اپنی فوج کو ساتھ لیا"[1] ... (خروج ۱۴: ۶)

"فرعون (شاہِ مصر) نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا کیونکہ بنی اسرائیل بڑے فخر سے نکلے تھے" (خروج ۱۴: ۸) ... "اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا، غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔" (خروج ۱۴: ۲۸-۲۹)

ان فقروں کے علاوہ کتاب زبور (Psalms) کے زبور ۱۳۶ سے فرعون کی موت کی تصدیق ہوتی ہے اور یہوواہ کا ذکر ہے جس نے "فرعون اور اس کے لشکر کو بحرِ قلزم میں ڈال دیا" (زبور ۱۳۶: ۱۵)

لہٰذا بات یوں ہوئی کہ ایک فرعون تو حضرت موسیٰؑ کے قیام مدین کے دوران میں مرا اور دوسرا خروج کے دوران میں۔ موسیٰؑ کے زمانے میں ایک نہیں بلکہ دو فرعون ہوئے ایک تو عہد ظلم و تشدد میں اور دوسرا مصر سے خروج کے دوران میں۔ فادر ڈی واکس نے جو ایک ہی فرعون (رعمیس دوم) کے ہونے کا نظریہ پیش کیا ہے وہ تسلی بخش نہیں

---

[1] مصنف نے کسی انگریزی بائبل سے 'اپنی فوج' (his army) کے الفاظ نقل کیے ہیں جبکہ بائبل کے اردو ترجمے میں "اپنی قوم کے لوگوں" کے الفاظ ہیں۔ اور ہمارے پاس انگریزی بائبل کا جو 'ریوائزڈ ورشن' کا نسخہ شائع کردہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی' لندن (۱۹۲۶ء) ہے۔ اس میں بھی 'اپنے لوگوں' (his people) کے الفاظ ہیں۔ اب کس کو صحیح مانا جائے؟ ترجمے کی اور تحریف واضح ہے۔ مترجم

کیونکہ اس سے تمام امور و واقعات کی گرہیں نہیں کھلتیں۔

مندرجہ ذیل باتیں بھی اس کے نظریئے کے خلاف جاتی ہیں۔

۳۔ رعمیس دوم کے عہد میں ظلم و تشدد کا آغاز ہوا جبکہ فرعون منفتاح عہد میں خروج واقع ہوا

مانیہرو نے اپنی تصنیف میں اسکندریہ کی جس روایت کا ذکر کیا ہے[1] پی مانٹے نے بڑی دانشمندی کے ساتھ اسے اختیار کر لیا ہے۔ بہت بعد میں اس (واقعہ خروج) کو اسلامی روایت میں جگہ ملی اور عیسائی کلاسکی روایت میں بھی[2]۔ یہ نظریہ مانٹے کی تصنیف "مصر اور بائبل"[3] میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس کی تائید اضافی دلائل سے ہوتی ہے جو خصوصی طور پر قرآن کے بیان پر مبنی ہیں جن کا حوالہ مشہور ماہر اثریات نے نہیں دیا لیکن ان کی جانچ پرکھ سے ہم بائبل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

کتاب خروج میں لفظ 'رعمیس' کا حوالہ ملتا ہے اگرچہ فرعون کا نام نہیں دیا گیا بائبل میں رعمیس ان شہروں میں سے ایک کا نام ہے جو یہودیوں سے جبری مشقت اور بیگار کے ذریعے تعمیر کرائے گئے تھے۔ آج ہمیں معلوم ہے کہ یہ شہر نیل کے ڈیلٹا کے مشرقی علاقے تانس۔ قنطیر کا حصہ ہیں۔ جس علاقے میں رعمیس دوم نے اپنا شمالی دارالحکومت

---

[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ مصر کے بطلیموس خاندان کے سنہری زمانے میں قدیم تاریخی دستاویزات کو اسکندریہ میں محفوظ رکھا گیا لیکن جب رومنوں نے مصر فتح کیا تو یہ تمام قیمتی تاریخی دستاویزات تلف و تباہ کر دی گئیں۔ آج اس نقصان کو بڑی شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔

[2] بیسویں صدی کے آغاز میں مرتب کی جانے والی "تواریخ مقدسہ" (Holy histories) مثلاً ایبے ایچ۔ لیسٹر (Abbe H. Lesetre) کی تاریخ میں جس کا مقصد مذہبی تعلیم ہے یہ کہا گیا ہے کہ خروج فرعون منفتاح کے عہد حکومت میں واقع ہوا۔ مصنف۔ [3] مطبوعہ فرانس ۱۹۵۹ء

تعمیر کیا تھا' وہاں اس کی تعمیرات سے پہلے بھی تعمیرات موجود تھیں لیکن رعمیس نے اسے ایک مقام بنا دیا جیسا کہ گزشتہ چند برسوں کے دوران کی جانے والی اثری کھدائیوں سے بخوبی ظاہر ہو چکا ہے۔ اس کی تعمیر کے لیے اس نے غلام یہودیوں سے کام لیا۔

آج جب ہم بائبل میں 'رعمیس' کا لفظ پڑھتے ہیں تو ہمارے کان کھڑے نہیں ہوتے جب سے چمپولین نے ڈیڑھ سو سال پہلے ہیرو غلیفی رسم الخط کو پڑھنے کا طریقہ معلوم کیا تب سے یہ لفظ ہمارے لیے بہت عام ہو گیا ہے' ہیرو غلیفی رسم الخط کو پڑھنے کا راز اس نے ان حروف کے مطالعہ و تحقیق سے معلوم کیا جن سے خود ہی لفظ (رعمیس) مرکب تھا لہٰذا آج ہم اسے پڑھنے اور بولنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اس کا مطلب بھی جانتے ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ تیسری صدی قبل مسیح کے لگ بھگ ہیرو غلیفات (خط تصویری) کے معنی گم ہو چکے تھے اور رعمیس کا نام بائبل اور چند یونانی اور لاطینی کتابوں کے سوا شاید ہی کہیں محفوظ رہا ہو۔ یونانی اور لاطینی تحریروں میں اس کی شکل کم و بیش بگڑ گئی تھی یہی وجہ ہے کہ طاسیطوس (Tacitus) اپنے 'وقائع' (Annals) میں رعمیس Rhamisis لکھتا ہے۔ تاہم بائبل میں صحیح نام محفوظ رہا۔ تورات میں اس کا ذکر چار دفعہ آیا ہے (پیدائش ۴۷:۱۱) خروج ۱:۱۱ اور ۱۲:۳۷' گنتی ۳۳:۳ اور ۳۳:۵)۔

'رعمیس' (Race mss) یا 'رعمسس' (Raeamss)[1]۔ بائبل کے یونانی نسخے موسومہ 'Septuagint' (ہفتادی مترجم)[2] اسے 'رعمیسے' (Ramesse) لکھا ہے۔ لاطینی نسخے (ولگیٹ) میں 'رعمیس' (Ramesses) ہے۔ کلیمنٹ نے بائبل کا ۱۶۲۱ء میں جو فرانسیسی میں ترجمہ کیا اس میں بھی 'رعمیس' (Ramesses) ہی لکھا ہے۔

---

[1] حرف 'ای' عبرانی کے 'عین' کا بدل ہے۔ مصنف

[2] عہد نامہ عتیق خاص کر تورات کا یہ یونانی ترجمہ حضرت مسیح کی ولادت سے ۲۷۰ سال پہلے کیا گیا تھا اور اس کے لیے ستر علما منتخب کیے گئے تھے۔ اس لیے یہ 'ہفتادی ترجمہ' کہلایا یعنی وہ ترجمہ جو ستر اشخاص نے مل کر کیا۔ مترجم

جب چیمپولیئن نے ہیروغلفی رسم الخط کا راز معلوم کیا تو اس وقت مذکورہ فرانسیسی ترجمہ متد
اول تھا۔ چیمپولیئن نے اپنی تصنیف " قدیم مصریوں کے ہیروغلیفی نظام کا خلاصہ"
(Summary of the hieroglyphic system of the ancient Egyphtiens)
(دوسرا ایڈیشن، ۱۸۲۸ء، صفحہ ۲۷۶) میں اس لفظ کے بائبل میں دئے گئے ہجوں کی طرف
اشارہ کیا ہے۔

اس طرح بائبل کے عبرانی، یونانی اور لاطینی نسخوں میں 'رعمیس' کا نام معجزانہ
طور پر محفوظ رہا۔[۲]

مندرجہ بالا کوائف حسب ذیل امور کے اثبات کے لیے کافی ہیں۔

(ا) جب تک ایک 'رعمیس' مصر کے تخت پر نہیں بیٹھا تب تک خروج کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔ (مصر کے گیارہ بادشاہوں کا یہی نام تھا)

(ب) موسیٰؑ اس فرعون کے زمانے میں پیدا ہوئے جس نے رعمیس اور رَیتوم کے شہر
تعمیر کرائے تھے۔ یعنی رعمیس دوم۔

(ج) جب موسیٰؑ مدین میں تھے تو حکمران فرعون (رعمیس دوم) مرگیا۔ موسیٰؑ کی زندگی کے
بقیہ واقعات رعمیس دوم کے جانشین منفتاح کے عہد میں پیش آئے۔

اس کے علاوہ بائبل کچھ دوسرے اہم کوائف کا اضافہ کرتی ہے جن سے تاریخ فراعنہ
میں خروج کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے اور یہ بائبل کا یہ بیان ہے کہ موسیٰؑ اسّی برس
کے تھے[۱] جب انھوں نے خدا کے حکم سے فرعون کے پاس جاکر اسے بنی اسرائیل کو آزاد کرنے

---

۱ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ بائبل کے پرانے ایڈیشنوں کے شارحین سرے سے اس لفظ کے معنی ہی
نہ سمجھ سکے مثلاً کلیمنٹ کی مترجمہ بائبل کے فرانسیسی ایڈیشن مطبوعہ ۱۶۲۱ء میں لفظ 'رعمیس' کی
جو تشریح کی گئی ہے وہ سراسر لغو اور بے معنی ہے اور وہ ہے "Thunder of vermin" یعنی
ذلیل لوگوں کے لیے بجلی کا کڑکا"۔ مصنف

۲ اس سلسلے میں آگے چل کر مترجم کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

پر آمادہ کرنا چاہا تھا:

"اور موسیٰؑ اسّی اور ہارون تراسی[۸۳] برس کے تھے جب وہ فرعون سے ہم کلام ہوئے۔"

(خروج ۷:۷)

تاہم دوسری جگہ (خروج ۲:۲۳) بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت جو
فرعون حکمران تھا وہ موسیٰؑ کے مدین کے قیام کے دوران میں مرگیا تھا۔ لیکن بائبل کا بیان
حکمران کے نام کی تبدیلی کا ذکر کیے بغیر جاری رہتا ہے۔ بائبل کی ان دو عبارتوں سے متبادر
ہوتا ہے کہ موسیٰؑ کے عہد کے ان دو فرعونوں کا عرصۂ حکومت کم سے کم اسّی سال پر محیط تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ رعمیس دوم نے ۶۷ سال حکومت کی (ڈرائٹون اور وانڈیر کے
مطابق ۱۳۰۱ء سے ۱۲۳۵ء قبل مسیح تک اور روٹن کے مطابق ۱۲۹۰ء سے ۱۲۲۴ء قبل مسیح تک)
لیکن ماہر مصریات اس کے جانشین منفتاح کے عرصۂ حکومت کے آغاز و اختتام کی صحیح تاریخیں
دینے سے قاصر ہیں۔ تاہم اس کی حکومت کم سے کم دس سال ضرور رہی جیساکہ فادر ڈی
واکس نشاندہی کرتا ہے کہ دستاویزوں سے اس کے دسویں سال حکومت کی شہادت ملتی
ہے۔ ڈرائٹون اور وانڈیر کی رائے میں منفتاح نے یا تو دس سال (۱۲۳۴ء سے ۱۲۲۴ء
قبل مسیح تک) یا بیس سال (۱۲۲۴ء سے ۱۲۰۴ء قبل مسیح تک) حکومت کی۔ ماہرین مصریات
کو ٹھیک طور سے معلوم نہیں ہوسکا کہ منفتاح کی حکومت کا خاتمہ کیسے ہوا۔ انھیں اس
کے کوئی آثار دستیاب نہیں ہوئے۔ بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی موت کے بعد
مصر تقریباً پچیس سال تک شدید قسم کی اندرونی سورشوں اور انقلابوں سے دوچار رہا۔

اگرچہ ان حکومتوں کے تاریخی وقائع اور کوائف بہت زیادہ صحیح نہیں ملتے تاہم 'نئی
بادشاہت' کے دوران میں بائبل کے بیان سے ہم آہنگ کوئی دوسرا عرصہ ایسا نہیں ملتا
جب (رعمیس دوم اور منفتاح کے عرصہ ہائے حکومت کے علاوہ) یکے بعد دیگرے
آنے والے دو بادشاہوں کا مجموعی عرصۂ حکومت اسی سال یا اس سے زیادہ رہا ہو۔ موسیٰؑ
نے جس عمر میں اپنے بھائیوں کی آزادی کا بیڑا اٹھایا' بائبل میں اس کا جو تعین پایا جاتا
وہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے کہ [redacted] سداس
ہے 'وہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ موسیٰؑ کی پیدائش اور مشن رعمیس

رعمسیس دوم اور منفتاح کے اسّی سالہ دورِ حکومت میں واقع ہوئے ہوں۔ تمام شہادتوں سے

۱؎ سیسوس اول (Sethos) اور رعمسیس دوم کی حکومتوں کا درمیانی عرصہ جو تقریباً اسّی سال بتایا جاتا ہے، وہ اس بحث سے باہر ہے کیونکہ سیسوس اول کا دورِ حکومت بہت مختصر تھا وہ موسیٰؑ کے قیامِ مدین کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ موسیٰؑ بالغ العمری میں مدین گئے تھے اور ایسا ان دو فرعونوں میں سے پہلے فرعون کی حکومت کے دوران میں ہوا جن سے موسیٰؑ کو اپنی زندگی میں سابقہ پڑا۔ مصنف

سورۂ قصص کی آیات ۲۷۔۲۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ مدین میں آٹھ یا دس سال رہے اور پھر وہاں سے اہل و عیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ اثنائے سفر میں نبوت سے سرفراز ہوئے اور اللہ نے انھیں فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا۔

قرآن کا یہ بیان بظاہر بائبل سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ بائبل کے مطابق موسیٰؑ فرعون کے پاس ۸۰ سال کی عمر میں گئے۔ لہٰذا اگر وہ قبطی شخص کے قتل کے بعد بھرپور جوانی میں مصر سے بھاگ کر مدین گئے تھے تو وہاں دس سال سے کہیں زیادہ طویل عرصے تک ٹھہرے، اور اپنے خسر کی بکریاں چراتے رہے۔ واپسی پر اثنائے راہ میں نبوت ملی تو ان کی عمر اسّی سال تھی۔ یہ بات بہت مستبعد معلوم ہوتی ہے۔ کیا اسّی سال کی عمر تک وہ اپنے خسر کی بکریاں ہی چراتے رہے اور بڑھاپے میں پیغمبری پا کر فرعون کے پاس گئے؟ قرآن کا بیان ہی درست معلوم ہوتا ہے بائبل کا بیان مزید تنقیح و تنقید کا متقاضی ہے۔

آگے چل کر مصنف کہتا ہے کہ فرعون رعمسیس دوم ۲۳ یا ۳۳ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ بائبل کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو اس فرعون کی بیٹی کے حکم سے دریا سے نکالا گیا اور اس نے انھیں بیٹا بنا لیا یعنی اس وقت فرعون کی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی یا کم سے کم وہ بالغ اور شادی کے قابل تھی۔ اگر تخت نشین ہوتے ہی فرعون کی اپنی شادی ہوئی ہو تو موسیٰؑ کو دریا سے نکالنے کے وقت اس کی بیٹی کی عمر تقریباً بیس سال تو ہونی ہی چاہیے اور خود فرعون کی اپنی عمر ۴۵۔۵۰ سال کے لگ بھگ۔ موسیٰؑ شہزادوں کی طرح پرورش پا کر جوان ہوئے اور پھر قبطی کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ اگر قتل [illegible] فرارِ مدین کے وقت موسیٰؑ کی عمر ۳۵۔۴۰ سال (بائبل اس بارے میں خاموش ہے) بھی مان لی جائے تو اس وقت فرعون رعمسیس دوم کی عمر تقریباً ۸۰۔۸۵ سال ہو گی۔ قرآن کے مطابق حضرت موسیٰؑ مدین میں آٹھ یا دس سال رہے۔ اس دوران میں رعمسیس دوم مر گیا اور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

یہی ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰؑ رعمسیس دوم کی حکومت کے آغاز میں پیدا ہوئے اور جب رعمسیس دوم سڑسٹھ سال حکومت کرنے کے بعد مرا تو وہ مدین میں قیام پذیر تھے۔ بعد میں وہ رعمسیس دوم کے بیٹے اور جانشین منفتاح کے پاس بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے نمائندہ بن کر گئے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ منفتاح نے بیس سال یا تقریباً بیس سال حکومت کی تو موسیٰؑ اس کے پاس اس کے عہدِ حکومت کے نصف آخر میں گئے ہوں گے۔ روٹن اسے ممکن سمجھتا ہے۔ اس طرح موسیٰؑ نے اس کے عہدِ حکومت کے آخر میں خروج کی رہنمائی کی ہو گی۔ اس کے برعکس کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ بائبل اور قرآن دونوں بتاتے ہیں کہ مصر سے نکلنے والے بنی اسرائیل کا تعاقب کرتا ہوا یہ فرعون اپنے انجام کو پہنچا تھا۔

موسیٰؑ کے عالمِ شیر خوارگی اور ان کے فرعون کے خاندان میں پہنچنے کے بارے میں کتبِ مقدسہ میں جو تفصیل دی گئی ہے، مندرجہ بالا بیان اس سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ یہ معلوم

(بقیہ حاشیہ) اس کے فوراً بعد موسیٰؑ نے مصر واپس جانے کی تیاری کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مذکورہ فرعون ۹۰ سال سے زائد عمر پا کر مرا۔ اس طرح موسیٰؑ تقریباً پچاس سال کی عمر میں نئے فرعون منفتاح کے دربار میں پہنچے اور اس کی حکومت کے بیس سال تک (اگر یہ مدت صحیح ہے) اس کے ساتھ کشمکش رہی۔ اس پر جو متعدد عذاب یکے بعد دیگرے نازل ہوئے وہ چند مہینوں یا چند سالوں میں تو نہیں نازل ہوئے ہوں گے۔ ایک عذاب کے بعد دوسرے تک اللہ نے فرعون کو مہلت دی ہو گی کہ اپنا رویہ درست کرے۔ خروج کے وقت (نہ کہ دوبارہ فرعون میں واپسی کے وقت) حضرت موسیٰؑ کی عمر ۷۰۔۸۰ کے درمیان رہی ہو گی۔ آئندہ ۴۰ سال انھوں نے بنی اسرائیل کے ہمراہ کنعان کی طرف ہجرت کے عالم میں گزارے جیسا کہ قرآن بتاتا ہے۔

اس طرح بائبل کے اپنے بیان سے نیز جدید تحقیقات سے بھی موسیٰؑ کے مدین میں قیام کے متعلق قرآن کا بیان کوئی عرصہ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق فرعون کی بیٹی نے نہیں بلکہ اس کی بیوی نے موسیٰؑ کو اپنا بیٹا بنایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہاں اس وقت تک طویل شادی شدہ زندگی کے بعد بھی بیٹا نہیں ہوا ہو گا اور فرعون اور وہ ادھیڑ عمر سے بھی آگے گزر چکے ہوں گے یعنی ۴۰۔۴۵ سال کے پیٹے میں ہوں گے اسی لیے موسیٰؑ کو بیٹا بنانا چاہا ہو گا۔ اس پہلو سے قرآن کا بیان ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مترجم

ہے کہ رعمیس دوم اپنی موت کے وقت بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی عمر ۹۰ یا ۱۰۰ سال تھی۔ اس مفروضے کے مطابق تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۲۳ یا ۳۳ سال تھی اور اس نے ۶۷ سال حکومت کی، تخت نشینی کے وقت اس کی شادی ہو چکی ہوگی اور کوئی بات اس کے خلاف نہیں جاتی کہ اس کے اہل خاندان نے (قرآن کے بیان کے مطابق) موسیٰؑ کو دریائے نیل سے نکالا۔ یا یہ کہ فرعون کی بیوی نے اسے موسیٰؑ کو اپنا بیٹا بنانے کے لیے کہا۔ بائبل کا دعویٰ ہے کہ موسیٰؑ کو فرعون کی بیٹی نے پایا اور اپنایا تھا۔ تخت نشینی کے وقت رعمیس دوم کی جو عمر تھی اس کے پیش نظر عین ممکن ہے کہ اس کی ایک اچھی خاصی عمر کی بیٹی ہو جس نے چھوٹے ہوئے بچے (موسیٰؑ) کو پایا ہو۔ اس حد تک قران اور بائبل کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں۔

یہاں جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ قرآن سے مطابقت رکھتا ہے اور بائبل کے صرف ایک بیان سے ہم آہنگ نہیں جو بائبل کی "کتاب سلاطین اول" (۶:۱) میں پایا جاتا ہے (اور یہ کتب سلاطین تورات میں شامل نہیں)۔ کتاب سلاطین کی اس عبارت[1] پر بڑی لے دے ہوئی ہے اور فادر ڈی واکس نے عہد نامۂ عتیق کے اس حصے میں پائے جانے والے تاریخی مواد کو مسترد کر دیا ہے۔ اس میں خروج کے واقعے کا تاریخی تعین ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کی نسبت سے کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ عبارت شک و شبے کا موضوع بنی ہوئی ہے اس لیے اسے مندرجہ بالا نظریے کے خلاف دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

مشہور و معروف کتبہ دار ستون کی تعبیر کو منفتاح کے پانچویں سال حکومت سے منسوب کرنے میں نکتہ چینیوں کو ہمارے بیان کردہ نظریے میں ایک بات قابلِ اعتراض معلوم ہوتی ہے

[1] یہ عبارت یہ ہے: "اور بنی اسرائیل کے ملک مصر سے نکل آنے کے بعد چار سو دسویں سال اسرائیل پر سلیمان کی سلطنت کے چوتھے برس زیو کے مہینے میں جو دوسرا مہینہ ہے ایسا ہوا کہ اس نے خداوند کا گھر بنانا شروع کیا۔" مترجم

کیونکہ ستون کے کتبے سے متبادر ہوتا ہے کہ یہودیوں کا تعاقب منفتاح کی حکومت کی آخری کارروائی تھی۔

یہ کتبے دار ستون بڑی دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ یہ واحد ہیروغلیفی تحریر ہے جس میں اسرائیل کا لفظ آیا ہے[1]۔ یہ کتبہ جو منفتاح کے عہدِ حکومت کے پہلے حصے میں لکھا گیا تھیبس (Thebes) کے مقام پر فرعون کے معبد تدفین میں دریافت ہوا اس میں ان مسلسل فتوحات کا ذکر ہے جو اس نے اپنی ہمسایہ مملکتوں پر حاصل کیں خصوصاً ایک فتح جس کا ذکر کتبے کے آخر میں ہے۔

"اجڑا ہوا اور برباد اسرائیل جس کا تخم تک باقی نہیں رہا۔"

اس بنا پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کتبے میں لفظ اسرائیل کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ منفتاح کے پانچویں سالِ حکومت تک یہودی کنعان میں جا کر آباد ہو چکے تھے۔ لہٰذا مصر سے یہودیوں کا خروج اس سے پہلے عمل میں آچکا تھا۔ یہ اعتراض قرین عقل نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہودی مصر میں رہ رہے تھے تو اس دوران میں کنعان میں کوئی یہودی نہیں رہتے ہوں گے اور یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ باوجودیکہ فادر ڈی واکس اس نظریئے کا حامی ہے کہ رعمیس دوم ہی خروج کا فرعون تھا تاہم وہ کنعان میں یہودیوں کی آبادکاری کے متعلق اپنی تصنیف "قدیم تاریخ اسرائیل" (The ancient history of Israel) میں یوں رقم طراز ہے:

"جنوب میں قادس کے علاقے میں اسرائیلیوں سے تعلق رکھنے والے گروہ کب آباد ہوئے کچھ واضح نہیں اور ایسا خروج سے پہلے ہوا۔"

لہٰذا اس کے نزدیک اس کا امکان ہے کہ یہودیوں کے بعض گروہ موسیٰؑ اور ان کے پیروؤں سے پہلے مصر سے نکل گئے ہوں۔ عیبرو یا ہیرو جنہیں بعض دفعہ اسرائیلی متخص کیا گیا

[1] لفظ اسرائیل کے فوراً بعد اس کا معنی توضیحی تعین کر دیا گیا ہے جس سے اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ اسرائیل سے مراد "انسانی گروہ یا جماعت" ہے۔

ہے، رعمسیس دوم اور خروج سے بہت پہلے شام اور فلسطین میں موجود تھے۔ ہمارے پاس دستاویزی شہادت موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ امینوفس دوم وہاں سے ۳۶۰۰ عپیرو قیدی بنا کر لایا تھا تاکہ مصر میں ان سے بیگار لی جائے۔ دوسرے عپیرو سیتوس اول کے زمانے میں کنعان میں موجود تھے جہاں انھوں نے بیت شیئان کے علاقے میں شورش برپا کی۔ اپنی تصنیف "مصر اور بائبل"[1] میں پی مانٹے ہمیں یہ یاد دلاتا ہے۔ لہٰذا یہ فرض کر لینا بالکل معقول اور ممکن معلوم ہوتا ہے کہ منفتاح اپنی سرحدوں پر پائے جانے والے ان باغی عناصر کی سرکوبی پر مجبور رہا ہو جب کہ اس کی مملکت کی سرحدوں کے اندر وہ اسرائیلی موجود تھے جو بعد میں موسیٰؑ کے گرد جمع ہوئے اور مصر سے نکل گئے۔ منفتاح کے پانچویں سال حکومت کے ہیروغلیفی کتبہ ستون سے موجودہ نظریے کو کوئی ضعف نہیں پہنچتا۔

علاوہ ازیں یہ امر واقعہ کہ لفظ اسرائیل یہودیوں کی تاریخ میں آیا ہے اُس کا اس تعدد سے قطعاً کوئی تعلق نہیں کہ موسیٰؑ اور ان کے پیرو کنعان میں آباد ہو چلے تھے۔ اس (لفظ (اسرائیل) کا ماخذ حسب ذیل ہے:

کتاب خروج (۳۲: ۲۹) کے مطابق اسرائیل دوسرا نام ہے اسحاقؑ کے بیٹے اور ابراہیمؑ کے پوتے یعقوب کا۔ بائبل۔ عہد نامۂ قدیم کے کل کلیسائی ترجمے (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) (Ecumenical translation of the Bible-old testament) کے شارحین کا خیال ہے کہ غالباً اس کا مطلب ہے "خدا اپنی طاقت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے"[2]۔ چونکہ یہ نام ایک فرد واحد کو دیا گیا ہے اس لیے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ایک سربرآوردہ اور ممتاز جد کی یادگار

[1] اصل کتاب فرانسیسی میں ہے 'L'Egypte et la Bible' اس کے انگریزی ترجمے کا نام ہے۔ 'Egypt and the Bible'

[2] بائبل کے عہد نامہ قدیم کی کتاب پیدائش (۳۲: ۲۸) میں یعقوبؑ کا نام "اسرائیل" ہونے کی یہ وجہ لکھی ہے: "اس (خدا) نے کہا تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔" اس سے پہلے کے فقروں میں یعقوب اور خدا کی کشتی کا بیان ہے جو برابر رہی!!! مترجم

کے طور پر اور نسبتی نسبت کے اظہار کے لیے یہ نام انسانوں کے ایک گروہ یا جماعت کو بھی دیا گیا۔ لہٰذا "اسرائیل" کا نام حضرت موسیٰؑ سے کئی سو سال پہلے سے موجود تھا۔ نتیجتاً فرعون منفتاح کے زمانے کے ایک ہیروغلیفی ستونی کتبے میں اس کے حوالے پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ کتبے میں اس کے ذکر سے اس نظریے کی تائید نہیں ہوتی کہ خروج کا واقعہ منفتاح کی حکومت کے پانچویں سال پیش آیا۔

اس کتبے میں ایک انسانی گروہ موسومہ "اسرائیل" کا ذکر ہے، نہ کہ کسی سیاسی طور پر قائم شدہ انسانی اجتماع کا کیونکہ یہ کتبہ تیرھویں صدی قبل مسیح کے آخر کا ہے جب کہ اسرائیلی ریاست دسویں صدی قبلِ مسیح سے پہلے موجود تھی۔ لہٰذا اس میں سیاسی طور پر قائم شدہ اسرائیل کا نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی ایک عام بھیڑ کا ذکر ہے[1]۔

آج کل ہم جانتے ہیں کہ "اسرائیل" آٹھ نو صدیوں تک ایک طویل تشکیلی دور سے گزرا جب کہیں اسے تاریخ میں داخلہ ملا۔ اس طویل عرصے کے دوران میں بہت سے نیم خانہ بدوش قسم کے گروہ خاص کر اموری اور آرامی، اس پورے خطے میں آباد ہوتے رہے اسی دوران میں اپنے قبیلوں، گروہوں میں انبیا اور بزرگانِ دین پیدا ہونے لگے جن میں ابراہیمؑ اسحاق اور یعقوب اسرائیل بھی تھے۔ آخر الذکر بزرگ کا دوسرا نام (اسرائیل) اس ابتدائی گروہ کو دیا گیا جس سے منفتاح کی حکومت کے بہت عرصے بعد مستقبل کی ایک سیاسی جماعت وجود میں آئی۔ اسرائیلی مملکت ۹۳۱ء یا ۹۳۰ء قبلِ مسیح سے ۷۲۱ء قبلِ مسیح تک قائم رہی۔

[1] ہیروغلیفی ستونی کتبے میں "اسرائیل" کے نام کے ساتھ "ملک" کی بجائے "لوگ" کا لفظ آیا ہے جیسا کہ کتبے میں پائے جانے والے دوسرے اسمائے موقعہ کے بارے میں ہے۔" یہ رائے یروشلم کے بیبلی اسکول کے پروفیسر فادر۔ بی۔ کورائیز نے کتاب خروج کے ترجمے پر اپنی شرح میں ظاہر کی ہے۔ (مطبوعہ، پیرس، صفحہ ۱۲")

(مصنف)

خروج کے دوران میں فرعون کی موت واقع ہونے کے متعلق کتبِ مقدسہ کا بیان

بائبل اور قرآن کے بیانات میں اس واقعے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بائبل میں اس کا ذکر نہ صرف تورات میں آیا ہے بلکہ زبور میں بھی۔ حوالے پہلے دیئے جا چکے ہیں۔

یہ بڑی ہی عجیب بات ہے کہ عیسائی شارحین نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ فادر ڈی واکس اس نظریئے کا قائل ہے کہ خروج کا واقعہ رعمسیس دوم کے عہد حکومت کے نصف اول یا درمیان میں پیش آیا۔ اس کے نظریئے میں اس امر واقعہ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی کہ فرعونِ وقت خروج کے دوران میں ہلاک ہو گیا تھا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے پیش نظر خروج کا واقعہ ایک عہد حکومت کے اختتام پر ہی پیش آ سکتا تھا اور اس لیے مفروضوں اور نظریوں میں اسے مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ یروشلم کے ببیکل اسکول کا سربراہ اپنی تصنیف "قدیم تاریخ اسرائیل" میں اس بات پر قطعاً پریشان اور متوشش نہیں کہ اس کے قائم کردہ نظریئے اور بائبل کی دو کتابوں۔ تورات اور زبور۔ کے بیانات میں تضاد پایا جاتا ہے۔

بی مانٹے اپنی تصنیف "مصر اور بائبل" (Egypt and Bible) میں لکھتا ہے کہ خروج کا واقعہ منفتاح کے عہدِ حکومت میں پیش آیا لیکن فرعون کی موت کے بارے میں کچھ نہیں کہتا جو فرار ہوتے ہوئے یہودیوں کے تعاقب میں خود اپنی فوج کا سربراہ بن کر گیا تھا۔

یہ بے حد حیران کن رویہ یہودیوں کے نقطہ نظر سے تضاد رکھتا ہے۔ مذکور ۱۳۶ کی آیت ۱۵ میں خدا کا شکر ادا کیا گیا ہے جس نے "فرعون اور اس کے لشکر کو بحر قلزم میں ڈال دیا" اور یہودی اپنی عبادت میں اکثر اسے دہراتے ہیں۔ وہ اس فقرے اور کتابِ خروج کی اس عبارت (۱۴: ۲۸-۲۹) کی باہمی مطابقت کو جانتے ہیں:

"اور پانی پلٹ کر آیا اور اس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا غرق کر دیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا۔"

یہودیوں کو اس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ نہیں کہ فرعون اور اس کے لشکر غرق ہو کر ہلاک ہوئے تھے۔ عیسائی بائبلوں میں بھی یہی عبارتیں موجود ہیں۔

تمام شہادتوں کے برعکس عیسائی شارحین جان بوجھ کر فرعون کی موت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان میں سے بعض قرآن میں پائے جانے والے حوالوں کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے قارئین کو عجیب و غریب مقابلے اور موازنے کرنے کی شہ دیتے ہیں۔ یروشلم کے ببیکل اسکول نے بائبل کا جو ترجمہ کیا ہے۔ اس میں فادر کورائیر (Couroyer) کا فرعون کی موت کے بارے میں حسبِ ذیل تبصرہ موجود ہے:

"قرآن اس (فرعون کی موت) کا ذکر کرتا ہے (۱۰: ۹۰-۹۲) اور عام روایت یہ ہے کہ فرعون جو اپنی فوج کے ساتھ غرق ہو گیا تھا (یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کا ذکر کتابِ مقدس[1] میں نہیں) سمندر کے نیچے زندہ ہے اور سمندر کے آدمیوں یعنی سیلوں[2] پر حکومت کرتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ قرآن کا وہ قاری جو اصل حقیقت سے بے خبر ہے' وہ قرآن کے بیان، جو شارح کے مطابق بائبل کے بیان سے متضاد ہے' اور اس لغو نام نہاد عام روایت میں ضرور باہمی رشتہ جوڑے گا کیونکہ شارح مذکور نے قرآن کے بیان کا حوالہ دینے کے فوراً بعد بڑی عیاری سے یہ لغو روایت اس کے ساتھ جوڑ دی ہے (تاکہ اسی کا تتمہ معلوم ہو)۔

قرآنی بیان کے اصل مطلب کا اس شارح کے مجوزہ مطلب سے کوئی تعلق نہیں۔ دسویں سورت کی آیات ۹۰ تا ۹۲ ہمیں بتاتی ہیں کہ بنی اسرائیل سمندر سے پار اتر گئے' جب کہ فرعون اور اس کا لشکر ان کا تعاقب کر رہے تھے اور یہ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو صرف تب وہ پکارا کہ:

---

[1] بلاشبہ یہاں شارح کی مراد بائبل سے ہے۔ مصنف

[2] سیل (Seal) ایک بڑا سمندری جانور ہے جسے دریائی بچھڑا یا سنگ ماہی بھی کہتے ہیں اور انسانوں سے ہل مل سکتا ہے لیکن یہاں شارح صاحب اسے سمندری آدمی قرار دے رہے ہیں۔ بہرحال مسلمانوں میں فرعون کے متعلق ایسی کوئی روایت نہیں' شائد عیسائیوں میں ہو۔ دراصل یہ لوگ قرآن کی پیشن گوئی کے مطابق فرعون کی برآمد ہونے والی لاش کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ مترجم

میں ایمان لایا جس (خدا) پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔ (جواب ملائکہ) اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مفسد بنا رہا؟ تو آج ہم تیرے بدن کو (سمندر سے) نکال دیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لیے عبرت کا نشان ہو۔"

قرآن میں فرعون کی موت کے متعلق بس یہی بیان پایا جاتا ہے یا ئبل کے شارح نے جس توہم اور خرافاتی روایت کا ذکر کیا ہے قرآن میں اس کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں ملتا[1] قرآن کی عبارت میں صرف اتنی بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ فرعون کی لاش کو بچا لیا جائے گا اور یہ اہم اطلاع ہے۔

جب پیغمبر اسلامؐ نے قرآن لوگوں کو سمجھایا تو اس وقت ان تمام فرعونوں کی لاشیں لکسر کے بالمقابل دریائے نیل کے دوسری طرف تھیبس کے شاہی مقبروں میں تھیں، جنھیں آج صحیح یا غلط طور پر کسی نہ کسی طرح خروج سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نزول قرآن کے زمانے میں ان کے بارے میں قطعاً کچھ بھی معلوم نہ تھا اور یہ مقبرے انیسویں صدی کے اختتام پر ہی دریافت ہوئے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے خروج والے فرعون کی لاش بچالی گئی تھی خواہ وہ کوئی بھی فرعون ہو، سیاح اسے قاہرہ کے عجائب گھر کے شاہی میوں کے کمرے میں دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا حقیقت اس لغو روایت سے بہت مختلف ہے جو فادر کورائیر نے قرآن سے منسوب کی ہے۔

فرعون رعمیس دوم کے بیٹے منفتاح کی جو تمام شہادتوں کے مطابق فرعون خروج ہے، کی ممی (حنوط شدہ لاش) ۱۸۹۸ء میں لورے (Loret) نے تھیبس کی وادیٔ شاہان میں دریافت کی تھی اور وہاں سے قاہرہ لے جائی گئی۔ ۸ جولائی ۱۹۰۷ء کو ایلیٹ اسمتھ نے اس کے اوپر

---

[1] احادیث میں بھی ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ مترجم

لپٹی ہوئی پٹیاں اتاریں۔ اس نے اپنی تصنیف "شاہی ممیاں" (Royal Mummies)[1] میں اس کا مفصل حال لکھا ہے اور لاش کے معائنے کی کیفیت بھی بیان کی ہے[2]۔ متعدد عضووں میں خرابی کے باوجود اس وقت ممی شدہ لاش کی حالت تسلی بخش تھی۔ تب سے یہ ممی قاہرہ کے عجائب گھر میں سیاحوں کو دکھائی جا رہی ہے۔ فرعون کا سر اور گردن کھلے ہیں لیکن باقی جسم کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے اور اتنی اچھی طرح چھپا ہوا ہے کہ تھوڑی مدت پہلے تک عجائب گھر میں اس کے جو عام فوٹو موجود تھے وہ وہی تھے جو ایلیٹ اسمتھ نے ۱۹۱۲ء میں لیے تھے۔

جون ۱۹۷۵ء میں مصری حکام نے بڑی مہربانی کی اور مجھے فرعون کی لاش کے ان حصوں کا معائنہ کرنے کی اجازت دی جو اس وقت تک ڈھکے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے فوٹو لینے کی بھی اجازت دی۔ جب ممی کی موجودہ حالت کا اس کی آٹھ سال سے زائد عرصہ پہلے کی حالت سے مقابلہ کیا گیا تو یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کی حالت بگڑ چکی تھی اور بعض

---

[1] مطبوعہ ۱۹۱۲ء

[2] ۱۹۰۷ء میں جب گرافٹن ایلیٹ اسمتھ نے منفتاح کی ممی پر سے پٹیاں کھولیں تو اس پر نمک کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ فرعون کھاری پانی یعنی سمندر میں ڈوب کر مرا تھا فراعنہ کی تاریخ میں صرف ایک ہی فرعون ایسا ہوا ہے یعنی وہ جس نے بنی اسرائیل کا خروج کے وقت تعاقب کیا اور ان کے پیچھے بحیرہ قلزم میں داخل ہو گیا تھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جب سر گرافٹن اسمتھ نے بنی اسرائیل کے تعاقب میں غرق ہونے والے فرعون کی ممی کی دریافت کا اعلان کیا تو عیسائی کلیسا کے چوٹی کے اربابِ اقتدار ان سے ملے اور ان پر زور دیا کہ وہ اپنا بیان واپس لے لیں کیونکہ اس سے قرآن کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔ مگر انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

وہ مقام جہاں غرق شدہ فرعون کی لاش سمندر کے پانی میں تیرتی ہوئی ملی تھی آج بھی جزیرہ نمائے سینا کے مغربی کنارے پر موجود ہے۔ مقامی باشندوں میں ہمیشہ سے یہ روایت چلی آتی ہے کہ فرعون کی لاش وہیں ملی تھی۔ فرعون کی نسبت سے اسے جبل فرعون اور حمامِ فرعون کہتے ہیں۔

SHIA ITHNA ASHERI JAMAT

اعضا غائب ہو چکے تھے۔ ممی شدہ نسیجوں (Tissues) کو انسانی ہاتھوں سے بھی کہیں کہیں بہت نقصان پہنچا تھا اور بعض دوسرے اعضا و اجزا میں مرورِ زمانہ سے بگاڑ واقع ہوا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر میں جب یہ ممی دریافت ہوئی تب سے اس کے تحفظ کی صورتِ حال میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں ان سے اس کے قدرتی انحطاط کی سمجھ آسانی سے آجاتی ہے۔ یہ ممی تھیبس کے شاہی قبرستان کے مقبرے میں تین ہزار سال سے زائد عرصے تک محفوظ پڑی رہی تھی اور وہیں سے دریافت ہوئی۔ آج کل یہ ممی محض ایک شیشے کے کیس میں نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہے لیکن یہ شیشے کا کیس اسے ہوا بستہ علیحدگی (Hermetic insulation) فراہم نہیں کرتا کہ باہر کے موسمی اثرات وغیرہ سے محفوظ و مامون رہ سکے اور نہ خرد حیواتی (Micro-organisnis) آلودگی سے اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اس پر درجۂ حرارت کے گھٹنے بڑھنے اور رطوبت میں موسم کے مطابق واقع ہونے والی تبدیلیوں کا اثر انداز ہونا ممکن ہے۔ جن حالات میں یہ ممی تقریباً تین ہزار سال تک انحطاط اور بگاڑ سے محفوظ رہی، اب وہ حالات میسر نہیں رہے (یعنی اہرامی مقبرے کی خاص طریقے سے تیار کردہ محفوظ اور ہوا بستہ فضا سے اب یہ ممی بہت دور ہو چکی ہے مترجم۔) اس کی حفاظتی پٹیاں اتاری جا چکی ہیں اور مقبرے کا وہ بند ماحول بھی نہیں رہا جہاں قاہرہ کے مقابلے میں درجۂ حرارت نسبتاً زیادہ یکساں اور غیر مبدل رہتا تھا اور ہوا میں رطوبت کمتر ہوتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جب یہ ممی خود شاہی قبرستان میں تھی تب بھی اسے قبریں لوٹنے والوں کی کارروائیوں، دست درازیوں (جو غالباً بہت پہلے شروع ہو گئی تھیں)۔ اور کترنے والے جانوروں کی آمد و رفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انھوں نے بھی کچھ نقصان پہنچایا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کی آزمائش و ابتلا کو برداشت کرنے کے لیے آج کے مقابلے میں پھر بھی حالات زیادہ سازگار تھے۔

جب جون ۱۹۷۶ء میں، میں نے ممی کا معائنہ کیا تو میرے مشورے پر خصوصی تحقیق و تفتیش کی گئی۔ ڈاکٹر ایل علیقی اور ڈاکٹر رمسیس نے ممی کا بہت عمدہ ریڈیو گرافک (تصور شاعی) مطالعہ کیا اور ڈاکٹر مصطفیٰ میناوی نے ... ایک ... کے ذریعے اندرونِ سینہ کا معائنہ

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMATE
MAYOTTE

کیا نیز پیٹ کی بھی تحقیق کی۔ آلۂ اندرون نما (Endoscope) کے ذریعے ایک ممی کے اندرونی اعضا کی تحقیق کی یہ پہلی مثال تھی۔ اس سے ہم اندرونِ جسم کی بعض بہت اہم تفصیلات دیکھنے اور ان کے فوٹو لینے کے قابل ہو گئے۔ پروفیسر سکالدی نے ممی کا عام طبی۔ قانونی مطالعہ کیا جس کی تکمیل بعض ایسے چھوٹے ٹکڑوں کے خوردبینی معائنے سے ہو گی جو ممی کے جسم سے خود بخود گر گئے تھے، یہ معائنہ پروفیسر مگنوٹ اور ڈاکٹر ڈلورنگاں کریں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کتاب کے چھپنے تک حتمی نتائجِ تحقیق کا اعلان نہ ہو سکے گا۔

اس تحقیق و معائنہ سے یہ بات تو ابھی سے واضح ہے کہ ہڈیوں کی ساخت میں متعدد فساد اور خلل دریافت ہوئے ہیں۔ ہڈیوں میں کشادہ جوف بھی ہیں (یعنی ہڈیاں اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہیں۔ مترجم) ان میں سے بعض مہلک بھی ہو سکتے تھے۔ اگرچہ ابھی یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ آیا ان میں سے بعض فرعون کی موت سے پہلے واقع ہوئے یا بعد میں۔ اغلب ہے کہ وہ ڈوب کر مرا، جیسا کہ کتبِ مقدسہ کا بیان ہے، یا ڈوبنے سے عین پہلے شدید قسم کی ضربات و صدمات کا اسے سامنا کرنا پڑا یا غرقابی اور ضربات بیک وقت پیش آئیں۔

ممی کے اعضا کی ساخت میں جو فاسد تغیرات پائے گئے ہیں اور اس میں جو مجموعی حیثیت سے بگاڑ واقع ہوا ہے جس کے اسباب اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان کا باہمی تعلق ممی کے تحفظ کو قدرے مشکل بنا دے گا اگر اسے اصلی حالت میں لانے کے لیے جلد اقدامات نہ کیے گئے اور احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی گئیں۔ یہ اقدامات ایسے ہونے چاہییں کہ فرعونِ خروج کی موت اور مرضیٔ خداوندی کے مطابق اس کی لاش کے بچ رہنے کی جو حتمی شہادت آج بھی ہمارے پاس موجود ہے، مرورِ زمانہ کے ساتھ مفقود نہ ہو جائے۔

اپنی تاریخ کی باقی ماندہ نشانیوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش انسان کو ہمیشہ کرنی چاہیے لیکن یہ معاملہ تاریخی نشانیوں کے تحفظ سے بھی زیادہ اہم ہے۔ یہ اس شخص کی ممی (حنوط شدہ لاش) کی مادی موجودگی کا سوال ہے جو موسیٰؑ کو جانتا تھا، اس کی دلیلوں، حجتوں، رستوں کو رد کرتا

---

[1] اس کتاب کا پہلا فرانسیسی ایڈیشن نومبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

رہا اور جب وہ (موسیٰؑ) اپنی قوم کو لے کر مصر سے فرار ہوا تو اس کا تعاقب کیا اور اس میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ حکم خداوندی سے اس کی لاش بچ گئی تاکہ جیسا کہ قرآن میں مرقوم ہے، انسانوں کے لیے سامانِ عبرت بن جائے۔[1]

جو حضرات جدید معلومات و اکتشافات میں کتبِ مقدسہ کی صداقت کا ثبوت ڈھونڈتے ہیں، انھیں قاہرہ کے مصری عجائب گھر کے شاہی ممیوں کے کمرے کو جاکر دیکھنا چاہیے وہاں انھیں فرعون کی لاش سے متعلق قرآنی آیات کی شاندار مجسم توضیح و تشریح دکھائی دے گی۔

---

[1] موسیٰؑ کے قصے کے دوسرے شاہد رعمیس دوم کی ممی کا مطالعہ و معائنہ بھی اسی طرح کیا گیا ہے جیسا کہ منفتاح کی ممی کا کیا گیا۔ اسے بھی اصلی حالت پر لانے کے لیے اسی قسم کے اقدامات کی ضرورت ہے۔ مصنف

[2] قاہرہ میں ۱۹۷۵ء میں ان ممیوں کا جو طبی نقطۂ نظر سے مطالعہ و معائنہ کیا گیا، اس کے نتائج مصنف نے ۱۹۷۶ء کے ابتدائی حصے میں علمی سوسائٹیوں کے سامنے پڑھے جن میں قومی طبی اکادمی بھی شامل ہے۔ جب مصری حکام کو ان نتائج کا علم ہوا تو انھوں نے رعمیس دوم کی ممی فرانس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ یہ ۲۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو "علاج" کی غرض سے پیرس پہنچ گئی۔

حال ہی میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ فرعونِ موسیٰؑ رعالباً منفتاح کی ممی اسی غرض سے انگلستان بھیجی گئی ہے۔ مترجم۔

قرآن، احادیث اور جدید سائنس

قرآن اسلامی عقیدے اور قانون سازی کا واحد سرچشمہ نہیں ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے اقوال اور افعال کے مطالعے کی روشنی میں شرعی و قانونی نوعیت کی اضافی و تکمیلی معلومات کی ضرورت محسوس کی گئی

اگرچہ ابتدا ہی سے ابلاغِ حدیث کے لیے تحریر کو ذریعہ بنایا گیا تاہم بہت سی احادیث زبانی روایت سے لوگوں تک پہنچیں۔ جن افراد نے جمع احادیث کا کام اپنے ذمے لیا، وہ گزشتہ واقعات کی تفصیل احاطۂ تحریر میں لانے سے پہلے ان کی خوب جانچ پڑتال کرتے تھے۔ جمع معلومات کا یہ کام بڑا کٹھن تھا تاہم جمع کنندگان کو صحت اور درستی کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ان کی حزم و احتیاط اور صحت پسندی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ معتبر اور وقیع مجموعہ ہائے احادیث کے مرتبین نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا ہے کہ جس شخص نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلِ بیت یا صحابہ میں سے کسی سے پہلے پہل کوئی حدیث سنی، پھر اس سے جس نے سنی حتیٰ کہ ہوتے ہوتے زبانی روایت سے مجموعۂ حدیث کے مرتب تک پہنچی، اول سے آخر تک راویوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا ہے اور تمام راویوں کے نام دیے ہیں۔[1]

اس طرح پیغمبرِ اسلامؐ کے اقوال اور افعال کے بہت سے مجموعے احادیثِ رسولؐ کے عنوان سے وجود میں آگئے۔ لفظ حدیث کے لغوی معنی ہیں اظہار، تقریر، بیان۔ لیکن اصطلاحاً یہ لفظ انؐ کے اعمال و افعال کو بیان کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

---

[1] اس طرح مسلمانوں نے 'اسماء الرجال' کا علم ایجاد کیا جو دنیا کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، راویوں کے ثقہ، غیر ثقہ، معتبر، غیر معتبر، قوی حافظ، کمزور حافظ، راستباز، کذاب وغیرہ ہونے کی خوب چھان پھٹک کی ہے۔ مترجم

احادیث کے بعض مجموعے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد کے دہوں میں منظر عام پر آ گئے تھے۔ صرف دو سو سال سے قدرے زائد عرصے کے اندر بعض اہم ترین مجموعہ ہائے احادیث مرتب ہو کر لوگوں کے سامنے آ گئے۔ واقعات و حقائق۔ صحیح ترین ریکارڈ بخاری اور مسلم کے مجموعوں میں ملتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے دو سو سال سے کچھ زائد عرصے بعد مرتب ہوئے اور ان میں دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ قابل اعتماد مواد ملتا ہے حالیہ سالوں میں اسلامی یونیورسٹی مدینہ کے ڈاکٹر محمد محسن خان نے ایک عربی۔ انگریزی ایڈیشن شائع کیا ہے[1]۔ عام طور پر بخاری کا مرتب کردہ مجموعۂ احادیث قران کے بعد صحیح ترین خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۱۴ء) ھداس (Houdas) اور مارکائی (Marcais) نے "اسلامی احادیث" (Traditions Islamiques) کے نام سے کیا۔ لہذا جو لوگ عربی نہیں جانتے احادیث تک ان کی بھی رسائی ہے لیکن بعض یورپی حضرات نے جو ترجمے کئے ہیں، اور ان میں فرانسیسی ترجمہ بھی شامل ہے، ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان میں غلطیاں اور غلط بیانیاں پائی جاتی ہیں جو زیادہ تر اصل ترجمے کی بجائے تشریح و تعبیر سے متعلق ہیں بعض دفعہ ان میں احادیث کا اصل مطلب کافی حد تک بدل جاتا ہے اور مترجمین اس کا وہ مطلب قرار دیتے ہیں جو در اصل نہیں ہوتا۔

جہاں تک ان کے ماخذوں کا تعلق ہے بعض احادیث اور اناجیل میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں کی کسی ایسے مصنف نے تالیف و تدوین نہیں کی جو بیان کردہ واقعات کا عینی شاہد ہو اور پھر یہ بھی ہے کہ وہ واقعات پر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مرتب کی گئیں۔ اناجیل کی طرح احادیث بھی سب کی سب صحیح تسلیم نہیں کر لی گئیں۔ اسلامی روایات کے متخصصین احادیث کی صرف ایک قلیل تعداد پر نیم متفق ہیں۔ مؤطا، صحیح مسلم اور صحیح بخاری کو مستثنیٰ کر کے احادیث کی باقی کتابوں میں

---

[1] صحیح البخاری کا یہ عربی۔ انگریزی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں سیٹھی سٹرا بورڈ ملز لمیٹڈ اور تعلیم القرآن ٹرسٹ گوجرانوالہ چھاونی پاکستان نے شائع کیا ہے۔ مصنف

پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم نے بھی صحیح بخاری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ مترجم

صحیح احادیث کے پہلو بہ پہلو ضعیف احادیث بھی ملتی ہیں۔ اور ایسی بھی جنہیں سرے سے رد کر دیا گیا ہے[1]۔ عیسائی کلیسا کی مسلمہ و مستند اناجیل پر بعض جدید عالموں نے اعتراضات کیے ہیں، لیکن کلیسا کے اعلیٰ احکام نے ان میں کبھی شک و شبہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس ان احادیث پر نکتہ چینی کی گئی ہے جو صحیح تسلیم کی جانے کی سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ تاریخ اسلام۔ ابتدائی دور میں اسلامی فکر و نظر کے ماہرین نے احادیث پر بھرپور نقد و جرح کی ہے اگرچہ بنیادی کتاب (قرآن) الله کے بے حوالہ کتاب رہی اور کسی نے انہیں محل اعتراض نہیں بنایا۔

میرے لیے یہ امر دلچسپی کا باعث تھا کہ احادیث کا گہرا مطالعہ کر کے یہ معلوم کروں کہ وحی و تنزیل سے ہٹ کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان موضوعات و مواد کے بارے میں کیا کہا جن کی تشریح و توضیح آنے والی صدیوں میں سائنسی ترقی سے ہونے والی تھی۔ اگرچہ صحیح مسلم بھی ایک مستند مجموعہ احادیث ہے۔ لیکن میں نے اس بارے میں اپنے مطالعے کو صرف ان احادیث تک محدود رکھا ہے جنہیں عام طور پر سب سے زیادہ صحیح اور معتبر سمجھا جاتا ہے یعنی صحیح بخاری کی احادیث۔

میں نے ہمیشہ یہ بات اپنے ذہن میں رکھنے کی کوشش کی ہے کہ یہ احادیث ان روایات کی بنا پر مرتب کی گئیں جو جزوی طور پر زبانی ایک سے دوسرے راوی تک پہنچی تھیں اور ان میں بعض حقائق کہیں زیادہ اور کہیں کم صحت سے ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ اس کا انحصار انفرادی غلطیوں پر ہے جو واقعات و اقوال کے راویوں سے سرزد ہوئیں ان حدیثوں سے مختلف ہیں جنہیں راویوں کی ایک بڑی تعداد نے بیان کیا وہ بلاشک و شبہ صحیح ہیں[2]۔

حدیث کے تحقیقی مطالعے سے میں جن نتائج پر پہنچا میں نے ان کا نتائج سے کیا جو اس کتاب کے قرآن اور جدید سائنس سے متعلق حصے میں

---

[2] مسلمان علماء نے حدیث اول الذکر کو ظنی کہتے ہیں اور موخر الذکر کو قطعی۔ مصنف

جا چکے ہیں۔ اس باہمی تقابل کے نتائج کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں ہیں جدید سائنسی انکشافات و معلومات سے ہم آہنگ قرآنی بیانات کی درستی اور سائنسی موضوعات سے متعلق بعض احادیث کے بیانات کی بے حد مشکوک نوعیت میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ عقل کو چکرا دیتا ہے۔ اس مطالعے میں صرف اس قسم کی احادیث کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

وہ احادیث جو قرآن کی بعض آیات کی تشریح و توضیح میں دی گئی ہیں، ان میں دی گئی بعض تفسیریں آج شاید ہی قابل قبول ہوں۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ سورہ یٰسین (۳۶) کی آیت ۳۸ جس میں کہا گیا ہے کہ سورج اپنے مقررہ ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے" بڑی معنوی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ" غروب کے وقت سورج عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت مانگتا ہے۔ اجازت دے دی جاتی ہے اور پھر ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ حسب معمول سجدہ کرنا چاہے گا اور اپنے مقررہ راستے پر چلتے رہنے کی اجازت مانگے گا۔۔۔ لیکن اسے حکم دیا جائے گا کہ جہاں سے آیا ہے ادھر ہی لوٹ جائے پس وہ مغرب سے طلوع ہوگا۔" (صحیح بخاری۔ اصل متن (کتاب بدء الخلق، جلد ۴ صفحہ ۲۸۳ پارہ ۵۴، حدیث نمبر ۴۲۱) مبہم ہے اور اس کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ تاہم یہ عبارت ایک رمز بنائے کی حامل ہے جس سے مراد زمین کے گرد سورج کی گردش کا راستہ ہے لیکن سائنس نے اس کے بالکل برعکس ثابت کیا ہے۔ اس حدیث کی صحت مشکوک (ظنی) ہے۔[1]

---

[1] یہ حدیث قرب قیامت سے متعلق ہے آج سورج اور زمین کا جو نظام گردش ہے وہ اس کارخانہ کائنات کے خالق و مالک کا مقرر کردہ ہے اور آگے چل کر کسی زمانے میں وہ اس نظام گردش کو الٹنا چاہے تو الٹ بھی سکتا ہے۔ نظام سیارگان میں ایسا خلل یا تبدیلی واقع ہو سکتی ہے اور یہ آثار قیامت میں سے ایک ہے۔ جدید تحقیق بھی یہ ہی کہتی ہے کہ اگر کسی وقت اپنے مدار سے ہٹ کر دو بڑے سیارے ٹکرا گئے (اور اس کا امکان ہے) تو دنیا کا خاتمہ ہو سکتا (باقی اگلے صفحے پر)

اسی کتاب کی ایک اور عبارت (کتاب ابتداء الخلق جلد ۴ صفحہ ۲۸۳، پارہ ۵۴، باب ۶ نمبر ۴۳۰) میں جنین کی نشوونما کے ابتدائی مراحل کی مدت ۴۰ دن بیان کی گئی ہے جس میں انسانی وجود کے عناصر جمع و ترتیب کی منزل سے گزرتے ہیں اگلے ۴۰ دن میں جنین ایک چمٹنے والی چیز (علقہ) کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد کے ۴۰ دن میں جنین "چبائے ہوئے گوشت" (مضغہ) کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جب فرشتے اس فرد کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کر لیتے ہیں تو اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ جنین کے ارتقاء کے متعلق یہ بیان جدید معلومات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ سورہ نحل (۱۶) کی آیت نمبر ۶۹ وہ واحد قرآنی عبارت ہے جس میں طبی امداد کے طور پر شہد کی شفابخشی کی خاصیت کا ذکر ہے (لیکن کسی خاص مرض کا نام نہیں دیا گیا) اس کے علاوہ قرآن میں کہیں علاج معالجے کے فن کے بارے میں قطعاً کوئی عملی مشورہ نہیں دیا گیا۔ لیکن احادیث میں ان موضوعات کو بہت جگہ دی گئی ہے۔ صحیح بخاری کا پارہ ۷۶ پورا کا پورا اسی موضوع سے متعلق ہے جو حداس اور ماکرمائی کے فرانسیسی ترجمہ کی چوتھی جلد

(بقیہ حاشیہ) ہے یا چاند سورج، زمین وغیرہ کا نظام گردش الٹ سکتا ہے اور سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے۔ حدیث میں یہی بات استعارہ کے انداز میں کہی گئی ہے۔ پہلے سائنس دانوں نے چاند اور سورج تک پہنچنے کا کب سوچا تھا۔ آج یہ ایک حقیقت ہے اور قرآن کی سورہ رحمٰن میں اس کا اشارہ موجود ہے)

فاضل مصنف چونکہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہے اور سائنس کا مطالعہ بھی رکھتا ہے۔ اس لیے اس نے ان احادیث پر تبصرہ کیا ہے جو علاج معالجے یا بعض دوسرے سائنسی موضوعات سے متعلق ہیں وہ علاج معالجے، مفرادویہ اور ان کی تاثیر کے متعلق ایلوپیتھک نقطہ نظر سے سوچتا ہے۔ حالانکہ دوسرے طریقہ ہائے علاج بھی ہیں۔ احادیث میں مذکورہ مفردات کے کیمیاوی تجزیہ و تحقیق کے بعد ہی ان کے متعلق کچھ یقین سے کہا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جو آج بھی بطور علاج مستعمل ہیں اور ان کی تاثیر مسلم۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ساری کی ساری احادیث تو صحیح نہیں خواہ وہ بخاری ہی کی کیوں نہ ہوں۔ مترجم۔

میں صفحہ ۶۲ سے ۹۱ تک پھیلا ہوا ہے اور ڈاکٹر محمد محسن خان کے ترجمے عربی، انگریزی ایڈیشن کی ساتویں جلد کے صفحات ۳۹۵ سے ۴۵۲ تک کو محیط ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان صفحات میں بعض طبی احادیث شامل ہیں لیکن یہ مجموعی حیثیت سے دلچسپ ہیں کیونکہ ان میں مختلف طبی موضوعات پر اس زمانے کی آراء کا خاکہ ملتا ہے۔ مزید برآں صحیح بخاری کے دوسرے حصوں میں بھی طبی نوعیت کی متعدد احادیث ملتی ہیں۔

اس طرح ہمیں احادیث میں نظر بد، جادو ٹونے اور جھاڑ پھونک کے امکان کے بارے میں بیانات ملتے ہیں[۲۲] لیکن یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ قرآنی آیات کے ذریعے جھاڑ پھونک وغیرہ کرنے پر کوئی معاوضہ نہ لیا جائے۔ ایک حدیث میں کھجور کی بعض اقسام کی یہ خصوصیت ملتی ہے کہ وہ جادو کے خلاف حفاظت کا کام دیتی ہے[۲۳] نیز یہ کہ زہریلے سانپوں کے خلاف جادو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے[۲۴]۔ اس زمانے میں جب کہ مفردادویات کے سائنسی طریقے سے استعمال کے امکانات محدود تھے، اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ لوگوں کو سہل و سادہ طریقہ ہائے علاج پر اعتماد کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا۔ فصد کھولنا، سینگی پچھنے لگانا، گرم لوہے سے داغنا، جوڑوں سے بچنے کے لئے سر منڈوانا اونٹنی کے دودھ اور بعض بیجوں مثلاً سیاہ زیرے نیز بوٹیاں مثلاً قسط ہندی کا استعمال اس زمانے کے قدرتی علاج تھے[۲۵]۔

(حواشی) [۲۲]، [۲۳]، [۲۴]، [۲۵]

جادو ٹونے جھاڑ پھونک کے متعلق اس جدید ترین سائنسی دور میں بھی مشاہدات پر مبنی کتابیں لکھی گئیں ہیں اور لکھی جا رہی ہیں اور لکھنے والے سیاح، شکاری، سائنس داں لوگ کوئی توہم پرست انسان نہیں ہیں۔ ایک اعلیٰ انگریز افسر کینتھ اینڈرسن جو جنوبی ہندوستان میں متعینات تھا اور مشہور شکاری بھی تھا۔ اس نے اپنی شکاری زندگی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ جنگل کے کنارے واقع ایک گاؤں میں اس نے ایک نوجوان خوبری لڑکی دیکھی جو کئی دن سے سخت اذیت میں مبتلا تھی۔ وہ جو بھی چیز کھانے کے لئے ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ میں ڈالتی، فوراً پتھر یا لکڑی میں تبدیل

(باقی حاشیہ اگلے صفحے میں)

(بقیہ حاشیہ):- ہو جاتی۔ معلوم ہوا کہ لڑکی کا رشتہ ایک شخص نے مانگا تھا مگر انکار کر دیا گیا۔ اس نے انتقاماً یہ جادو کرایا تھا۔ آخر لڑکی والوں نے ایک دوسرے جادوگر کو بھاری رقم دے کر اس کا توڑ کرایا اور لڑکی کی جان بچی۔

کینتھ اینڈرسن نے لکھا ہے کہ وہ اس واقعے کا عینی شاہد ہے۔ جہاں تک جھاڑ پھونک کا تعلق ہے یہ آج بھی ہوتی ہے۔ نام بدل گئے ہیں۔ ہپناٹزم سمریزم میں جو پاس کئے جاتے ہیں اور الفاظ دہرائے جاتے ہیں، وہ کیا ہیں؟ یورپ اور امریکہ میں جو جگہ جگہ روحانی علاج کے ڈاکٹر (Shiritual healing clinic) کھلے ہوئے وہ کیا ہیں؟ میرے سامنے اس وقت ایک کتاب موسومہ "دی سائنس آف سائیکنگ ہیلنگ" یعنی نفسیاتی علاج کی سائنس پڑی ہے اس کا بھی یہی موضوع ہے۔ قرآن کی پہلی صورت فاتحہ کا نام سورۃ شفا بھی ہے اور اس کی شفا بخشی کی خاصیتیں مسلم ہیں۔ اسی طرح آیت الکرسی کی تاثیر بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہی حال سورۂ اخلاص اور آخری دونوں سورتوں معوذتین اور بعض دوسری سورتوں اور آیات کا ہے۔ ان کے ذریعے جھاڑ پھونک جادو کے زمرے میں نہیں آتی۔ البتہ پڑھنے اور جھاڑ پھونک کے قاعدے اور اصول ہوتے ہیں۔ قرآنی آیات کے علاوہ بعض ایسے منتر پڑھنے کی اجازت ہے جن کے الفاظ بامعنی ہوں اور سمجھ میں آتے ہوں۔ بخاری میں عمران بن حسین رضی کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منتر پڑھنے کی اجازت صرف سانپ، بچھو اور دوسرے زہریلے جانوروں کے کاٹنے یا نظر بد کا ازالہ کرنے کے لئے اور دوسرے کاموں کے لئے ممنوع ہے۔ آگے چل کر اسی روایت میں عبد اللہ ابن عباس کے حوالے سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا گیا ہے کہ میری امت میں سے ستر ہزار افراد حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ وہ ایسے لوگ ہوں گے جو شگون نہیں لیتے، منتر نہیں پڑھتے رہے جسموں پر داغ نہیں لگوا تے رہے اور صرف اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (بخاری جلد ۳، پارہ ۲۴ باب ۷۱، حدیث ۲۵، مترجم سید نائب حسین نقوی شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور) اس سے ظاہر ہے کہ اسلام ان چیزوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ صرف ہنگامی حالات میں اجازت دیتا ہے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحے میں)

(بقیہ حاشیہ)

مترجم کے یہ ذاتی مشاہدے کی بات ہے کہ آزادی سے قبل ہندوستان کے صوبہ متوسط (اب مدھیہ پردیش) جو جنگلات سے بھرا ہوا ہے اور سانپ کاٹنے کے واقعات بہت ہوتے ہیں، ایک ہندو سیٹھ کی طرف سے کٹنی (جبل پور) ریلوے لائن کے ہر اسٹیشن پر اس مضمون کے اشتہار جلی حرف میں لگے ہوئے تھے کہ جس کو سانپ کاٹے وہ اس سیٹھ کا نام لے کر کہے کہ اے سانپ سیٹھ کا حکم ہے کہ اپنا زہر واپس لے لے اور زہر اتر جائے گا۔ استفسار سے معلوم ہوا کہ واقعی ایسا ہوتا تھا پنجاب کے ضلع قصور کے ایک گاؤں میں ایک شخص سانپ کا زہر اتارتا تھا، اگزیدہ کا کوئی استعمال شدہ کپڑا کرتہ وغیرہ اس کے پاس لے جاتے وہ اس پر کچھ پڑھ کر واپس کر دیتا اور سانپ کا زہر اتر جاتا۔

بخاری میں ایک مار گزیدہ پر ایک صحابی کے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے اور اس کے اچھا ہو جانے کا واقعہ درج ہے (جلد ۳ پارہ ۲۴، باب ۲، حدیث ۸ صفحہ ۲۲۵) مترجمہ سید نائب حسین نقوی۔ شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔ چونکہ مترجم کو صحیح بخاری کے وہ انگریزی تراجم حاصل نہیں، جس کا فاضل مصنف نے حوالہ دیا ہے۔ اس لئے ہر جگہ مندرجہ بالا اردو ترجمہ کو حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ آگے بھی اس ترجمے کے حوالے آئیں گے۔

نظر بد.

بخاری (جلد ۳، پارہ ۲۳ باب ۳۶، حدیث ۵۵ صفحہ ۲۳۰) میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ نظر لگنا برحق ہے۔

اگر نظر بد کی کوئی اصلیت نہ ہوتی تو دنیا بھر کے لٹریچر میں اس کا ذکر نہ ہوتا۔ اردو میں عام طور پر خوب صورت بچے یا کسی دوسری عمدہ چیز وغیرہ کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ خدا نظر بد سے بچائے ایک بہت مشہور مصرع بھی ہے ؎۔

خدا جانے کس کی نظر کھا گئی! خود انگریزی میں The Evil Eye کے الفاظ موجود ہیں۔ مشاہدات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ آنکھ کی فسوں کاری اور انگریزی مسلم ہے۔ کمزور طبائع خاص کر بچوں پر اس کا اثر جلدی اور زیادہ ہوتا ہے۔ ہپناٹسٹ بھی اسی سے کام لیتا ہے۔ اگر آپ کو دوسرے علاج میسر ہیں تو بے شک کیجئے۔ جھاڑ پھونک کی طرف نظر لازم نہیں نظر بد کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ) ہو از اس کے لئے بھی قرآنی آیات یا بامعنی دعائیہ کلمات سے جھاڑ پھونک کی جائے۔ مثلاً بخاری کی جلد ۳، پارہ ۲۴ باب ا ص ۲۳۳-۲۳۴ پر رسول اکرمؐ سے نظر بد کی جھاڑ پھونک کی جائے جو رقیے (منتر) روایت کئے گئے ہیں وہ سب کے سب اللہ سے دعائیں ہیں۔ یہاں ایک کا ترجمہ دیا جاتا ہے "اے مخلوق کے پروردگار! تکلیفوں کے دفاع کرنے والے! تو اچھا کردے تو ہی شفا بخشنے والا ہے اور ایسی شفا عنایت فرما جس کے بعد کوئی بیماری نہ رہے۔

کھجور کی تاثیر :-

صحیح بخاری (جلد ۳ پارہ ۲۴) باب ۱۵، احادیث ۲۶، ۲۷ ص ۲۴۲ اور باب ۱۹ حدیث ۳۴ ص ۲۴۴) میں یہ آیا ہے کہ جس نے صبح کو سات عجوہ کھجوریں کھائیں اس دن اسے کوئی زہر یا جادو نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ عجوہ مدینے کے کھجوروں کی ایک بہترین قسم ہے۔ مترجم کو اس کے کھانے کا اتفاق ہوا ہے ہو سکتا ہے کہ اس کھجور میں ایسی کوئی خاص بات ہو۔ اس کا کیمیاوی تجزیہ کرنے کے بعد ہی کسی حتمی فیصلے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق ایک سے زائد احادیث کی موجودگی یونہی دوسروں کی سنی سنائی باتوں یا جعلی روایتوں پر مبنی نہیں ہو سکتی لیبارٹری میں اس کا کیمیکل تجزیہ کرانا دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کیمیکل تجزیہ سے یاد آگیا کہ کوئی بیس سال پہلے پی سی ایس آئی آر لیبارٹریز لاہور نے سونے کے کشتہ کا تجزیہ کر کے رپورٹ دی تھی کہ اس میں وہ تاثیر بلکہ تاثیرات مشاہدے میں نہیں آئیں جو یونانی اطبا کے ہاں مسلم ہیں۔ یونانی اطبا کے ہاں سونے کا کشتہ بنانے کے ایک سے زیادہ طریقے ہیں اور ہر ایک کے لوازمات الگ الگ ان کی اپنی تاثیر بھی ہوگی سائنسدانوں نے محض کشتہ کر کے منفی رپورٹ دیدی۔

لہ فصد، سینگی، پچھنے، داغنے، جوؤں سے بچنے کے لئے سر منڈوانے، زخموں میں چٹائی کی راکھ بھرنے اونٹنی کے دودھ وغیرہ کے استعمال کے متعلق فاضل مصنف نے خود ہی توجیہہ اور جواز مہیا کر دیئے ہیں کہ اس زمانے کے قدرتی، ہنگامی اور سستے علاج تھے۔ داغنے سے تو رسول اکرمؐ نے سختی سے منع کیا ہے۔ فصد، سینگی اور پچھنے کا استعمال آج بھی پاکستان اور بھارت کے دورافتادہ دیہات میں ہوتا ہے۔ جہاں جدید طریقہ ہائے علاج کی سہولتیں میسر نہیں۔ اگر پیغمبر نے بھی بعض ادویہ کے استعمال کا مشورہ دیا ہو تو اس میں اعتراض کیا ہے۔؟

مترجم

زخموں سے خون بند کرنے کے لیے کھجور کے پتوں کی چٹائی کو جلاکر اس کی راکھ زخم میں بھرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا[1]۔ ہنگامی حالات میں وہ تمام ذرائع کام میں لائے جاتے تھے جو فی الوقت مفید ثابت ہوسکتے تھے۔ لیکن لوگوں کو اونٹ کا پیشاب پینے کا مشورہ دینا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا[2]۔ آج مختلف امراض سے متعلق بعض تشریحات کو تسلیم کرنا مشکل ہے یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

بخار کے اسباب و وجوہات:-

اس خیال کی تائید و شہادت کے طور پر چار روایات موجود ہیں کہ "بخار دوزخ کی آگ سے ہے"۔ (صحیح بخاری، کتاب الطب جلد ۷، باب ۲۸، صفحہ ۴۱۶)[3]

ہر مرض کا علاج موجود ہے:-

خدانے کوئی مرض ایسا پیدا نہیں کیا جس کی دوری پیدا نہ کی ہو"۔ (بہ حوالہ مذکور۔ باب ۱ صفحہ ۳۹۵) اس تصور کی وضاحت مکھی والی حدیث سے ہوتی ہے "اگر تم میں سے کسی کے (پانی، شربت وغیرہ کے) برتن میں مکھی گرجائے تو اسے چاہیے کہ وہ پوری مکھی کو برتن میں

---

[1] صحیح بخاری (جلد ۳ پارہ ۲۳ باب ۲۷ حدیث ۳۶ صـ۳۱۵) میں سہل بن سعد الساعدیؓ سے روایت ہے کہ "جنگ احد میں رسول اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زخمی ہوئے تو حضرت علیؓ ڈھال میں پانی بھر کر لائے اور حضرت فاطمہؑ نے آپ کے زخموں کو دھویا۔ جب خون نہ رکا تو ایک چٹائی جلاکر اس کی راکھ آپ کے زخموں میں بھیر دی جس سے خون بند ہوگیا"۔ یہ ایک امر واقعہ کا بیان ہے۔ مشورہ یا علم نہیں۔ دورافتادہ دیہات میں جہاں جدید طبی سہولتیں میسر نہیں۔ آج بھی ہنگامی حالت میں ایسا کیا جاتا ہے۔

[2] اونٹ کا پیشاب

فاضل مصنف نے اونٹ کا پیشاب پینے کا مشورہ پسند نہیں کیا اور اس میں کراہت محسوس کی ہے۔ یہ نہیں لکھا کہ اس میں طبی نقطہ نظر سے کوئی افادیت نہیں ہے۔ انس بن مالک کی روایت (بخاری جلد ۳، پارہ ۲۳، باب ۶، حدیث ۹ صـ۲۱۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشورہ ایک مخصوص گروہ کو خاص حالات میں دیا گیا تھا اور پھر اس کا اعادہ نہیں ہوا۔ صورت واقعہ یوں تھی کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوکر کہنے لگے کہ ہم لوگوں کو مدینے کی آب و ہوا

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

(بقیہ حاشیہ):-

راس نہیں آئی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ تم لوگ اونٹ کے چرواہوں سے اونٹ کا پیشاب لے کر پیو۔ انہوں نے چرواہوں سے پیشاب اور دودھ لے کر پیش کیا اور تندرست ہوگئے"۔ (بقیہ حدیث کا موضوع سے تعلق نہیں اس لیے حذف کردی ہے)

راقم الحروف کے ذاتی علم میں ہے کہ آزادی سے قبل پنجاب کے دیہات میں ہندو اور جینی حضرات مسلمان اونٹ والوں سے اونٹنی کا پیشاب اور دودھ لے کر، بلکہ دودھ میں بھی اونٹ کی دم پھرا کرلے جاتے تھے اور اپنی طحال اور پیٹ کی دوسری بیماریوں میں مبتلا عورتوں کو پلاتے تھے اور وہ تندرست ہوجاتی تھیں۔ خیر یہ تو پرانی باتیں ہیں آج بھی بھارت کے سابق وزیراعظم مرار جی ڈیسائی اونٹ کا تو کیا خود اپنا پیشاب پیتے ہیں اور اس کی شفابخشی کی قولوں کے قصیدے بھی الاعلان سناتے ہیں۔ ہندوؤں میں گائے کا پیشاب پینے اور متعدد دوسرے طریقوں سے استعمال کرنے کا رواج ہے اور ہے۔ بہرحال اونٹ کا پیشاب پینے کا حکم نہیں۔ چونکہ اونٹ صحرائی درختوں کے پتے اور دوسری جڑی بوٹیاں کھاتے ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ ان کے پیشاب میں ایسی خاصیت ہو۔ بہرحال اس کا کیمیاوی تجزیہ کرتے ہی سے یہ پتہ چل سکتا ہے۔

بخار کے اسباب

عبداللہؓ ابن عمرؓ سے روایت ہے (بخاری جلد ۳ پارہ ۲۳ باب ۲۸ حدیث ۳۷ صـ۲۲۵) کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "بخار جہنم کا شعلہ ہوتا ہے لہذا پانی ڈال کر اس کی گرمی کو بجھاؤ"۔ آگے چل کر حدیث نمبر ۳۹ میں حضرت عائشہؓ سے اور حدیث نمبر ۴۰ میں رافعؓ بن خدیج سے بھی یہی روایت ہے۔ یہاں شعلۂ جہنم کے الفاظ سے یہ مراد نہیں کہ بخار فی الواقع دوزخ کی آگ کا شعلہ ہے بلکہ مراد اس کی حدت و حرارت ہے۔ جو بخار زدہ کے جسم و جان کو پھونکتی ہے۔ لہذا مریض کے جسم پر پانی ڈالنے اور اسے ٹھنڈا کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جہنم کے اصل شعلے تو ایسے پانی سے نہ بجھیں گے۔

آجکے جدید ڈاکٹر بھی شدید بخار کی صورت میں مریض کی پیشانی وغیرہ پر برف رکھواتے ہیں تاکہ حرارت کم ہوجائے کیا یہ پانی ڈلوانے کی بدلی اور ترقی یافتہ صورت نہیں؟ اس زمانے میں عرب میں برف کہاں میسر تھی؟ مترجم

ASSOCIATION KHOJA SHIA ITHNA ASHERI JAMATE

غوطہ دے دے اور پھر اسے نکال کر پھینک دے۔ کیونکہ اس کے ایک پیر میں بیماری ہے اور دوسرے میں صحت یعنی اس بیماری کا علاج" (بحوالہ مذکور، باب ۱۵، ۱۶، صفحات ۲۷۴، ۵۳۴ نیز کتاب بدر الخلق پارہ ۵۴، ابواب ۱۵، اور ۱۶)[ﷺ]

سانپ کے نظر آنے سے اسقاط حمل (جو اندھا بھی کر سکتا ہے)

اس کا ذکر صحیح بخاری کی کتاب بدا الخلق جلد ۴، ابواب ۱۳، اور ۱۴ صفحات ۳۳۰ اور ۳۳۴ پر ہے[ﷺ]۔

---

[۱] ہر مرض کا علاج موجود ہے اور مکھی والی حدیث۔

ابوہریرہ رضؓ سے (بخاری جلد ۳ پارہ ۲۳، باب ۱، حدیث (صفحہ ۲۱۵) روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اللہ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی جس کا علاج بھی خود پیدا نہ کیا ہو" اس حدیث میں کوئی اشکال یا محال بات نہیں ہے خدا نے علاج پیدا کئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مرض کا علاج ہمیں آج معلوم نہ ہو اور آگے چل کر معلوم ہو جائے۔ کچھ عرصے پہلے تک تپ دق لاعلاج مرض خیال کیا جاتا تھا اب قابل علاج ہے۔ طاعون اور چیچک کا بھی یہی حال رہ چکا ہے۔ اب یہ دونوں مرض تقریباً ناپید ہیں۔ سرطان ابھی تک ناقابل علاج ہے مگر تحقیقات جاری ہے انشااللہ حتمی علاج بھی دریافت ہو جائیگا

نپولین نے کہا تھا کہ دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں لغات سے ناممکن کا لفظ نکال دیا جائے نپولین کے اس مقولے کی بڑی شہرت ہوئی اور اس کے حوالے دیے گئے لیکن تعجب ہے کہ پیغمبر اسلام جب یہ کہیں کہ ہر مرض کا علاج خدا نے پیدا کیا ہے تو اس کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا جائے۔

[۲] مکھی کے ایک پیر میں بیماری اور دوسرے میں شفا والی حدیث بخاری جلد ۳ پارہ ۲۴ باب ۱۲ صفحہ ۲۴۵ پر نمبر ۳ موجود ہے۔ مصنف نے اسے غلط بتایا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ تجربہ و تجزیہ سے غلط ثابت ہوئی ہے۔ یہ حدیث خاصی شہرت رکھتی ہے۔ بہرحال غلط بھی ہو سکتی ہے۔ بخاریؒ بھی آخر ایک انسان تھے۔ انہوں نے سلسلہ راویان کے معیار کو پرکھ کر اسے شامل کتاب کیا۔ ویسے اس عمل میں جو ظاہری کراہت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

افسوس ہے کہ مترجم کے پاس صحیح بخاری کا جو نسخہ مترجم نائب حسین نقوی ہے اس میں سانپ کے
(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMATE

ایام ماہواری کے درمیان سیلان خون:۔

صحیح بخاری کی کتاب الحیض جلد ۶ پارہ ۶ صفحات ۹۰۔۴ اور ۹۵۔۴ میں اس موضوع پر دو حدیثیں موجود ہیں (ابواب ۱۲ اور ۲۸) ان میں دو عورتوں کا ذکر ہے۔ پہلی عورت کے بارے میں علامات (بغیر تفصیل کے) بیان کی گئی ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ سیلان خون کسی رگ سے آتا ہے۔ دوسری عورت کے ایام ماہواری کے درمیان میں سات سال تک سیلان خون میں مبتلا رہی۔ اس کی وجہ بھی خون کی وہ رگ بتائی گئی ہے۔ مذکورہ بالا کیس کے اصل اسباب کے متعلق مفروضہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اندازہ لگانا آسان نہیں کہ اس تشخیص کی تائید میں اس زمانے میں کیا دلائل پیش کیے جا سکتے۔ تاہم یہ تشخیصی مفروضہ کافی حد تک درست ہوتا۔

یہ بیان کہ امراض متعدی نہیں ہوتے:۔

صحیح بخاری میں متعدد مقامات (کتاب العلاج پارہ ۶۷، ابواب ۱۹، ۲۵، ۳۰، ۳۱، ۵۳، اور ۵۴) پر بعض خاص امراض (مثلاً جذام (صفحہ ۴۰۸)، طاعون (صفحات ۴۱۸ اور ۴۲۱)

(بقیہ گذشتہ صفحے کا حاشیہ)

کے متعلق حدیث نہیں مل سکی، خوف و دہشت سے اسقاط حمل کے واقعات عام ہیں۔ سانپ کی دہشت سے بھی اسقاط حمل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک اندھا ہونے کا تعلق ہے، حدیث کے الفاظ دیکھے بغیر کچھ کہنا مشکل ہے۔ ویسے عام تصور اس کے برعکس ہے یعنی یہ معاملہ عورت کی آواز سن کر سانپ اندھا ہو سکتا ہے۔ مترجم کو ان میں سے کسی کا مشاہدہ نہیں ہو سکا۔ مترجم

[۱] اس قسم کے سیلان خون کو فقہا کی اصطلاح میں استحاضہ کہتے ہیں یعنی "ابنارمل حیض" مصنف کو حدیث کے ان الفاظ پر اعتراض ہے کہ یہ خون کسی رگ سے آتا ہے۔ اور پھر خود ہی آگے چل کر مبہم طور پر ایک تشخیصی مفروضہ کا ذکر کیا ہے اور مطمئن ہو گیا ہے۔ میرے نزدیک خون کے رگ سے آنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نارمل حیض نہیں اور اس پر طہارت کے مقررہ احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ (مترجم)

اونٹ کی خارش (صفحہ ۲۴۴) کا ذکر آیا ہے اور عمومی بیانات بھی ہیں جو نمایاں طور پر متضاد اقوال و آرا کے پہلو بہ پہلو رکھے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ طاعون زدہ علاقے میں نہیں جانا چاہیے اور جذامیوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔[1]

اندریں حالات یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بعض احادیث سائنسی نقطہ نگاہ سے قابل قبول نہیں ان کی صحت مشکوک ہے ان کا حوالہ دینے کا مقصد محض قرآن کی مذکورہ بالا آیات

---

[1] امراض متعدی ہوتے ہیں یا نہیں

یہ درست ہے کہ کچھ متضاد بیانات بھی موجود ہیں لیکن تمام آثار و قرائن اور بیانات کی اکثریت کو مدنظر رکھ کر حکم لگانا ہوگا۔

بخاری جلد ۳ پارہ ۲۴ باب ۱۶ کی حدیث نمبر ۲۸ (صہ ۲۴۳) میں ابتداً کہا گیا ہے کہ بیماریوں کے ایک دوسرے کو لگنے کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور ایک اونٹ سے دوسرے اونٹ خارش لگنے کا ذکر کرکے سوال کیا گیا ہے کہ آخر پہلے اونٹ کو خارش کہاں سے لگی؟ لیکن آگے چل کر ابوسلمہ ابوہریرہ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ کسی بیمار کو تندرست آدمی کے پاس نہ رکھو" اور ابتداً جو کہا گیا اس سے انکار کرتے ہیں۔

اس آخری نقطۂ نظر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ابوہریرہؓ نے رسول اکرمؐ کے روایت کی ہے کہ "جذامی سے اس طرح بھاگنا چاہیے جس طرح شیر سے دور بھاگتے ہیں" مطلب یہ ہے کہ یہ سخت خطرناک متعدی مرض ہے۔

اس طرح طاعون کے متعلق (جلد ۳، پارہ ۲۳ باب ۳۰ حدیث ۳۴) عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت موجود ہے کہ "حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جس جگہ وبا پھیلتے ہوئے سن لو وہاں نہ جاؤ اور اگر تمہاری جائے قیام پر وبا پھیل جائے تو اس مقام کو چھوڑ کر نہ بھاگو"۔ مطلب یہ ہے کہ متاثرہ مقام پر جاکر مرض لگنے کا خطرہ مول نہ لو اور متاثرہ مقام پر وبا پھیل جائے تو دوسری جگہ مرض کے جراثیم نہ لے جاؤ۔ اس زمانے میں اس سے بڑھ کر حفاظتی تدبیر اور کیا ہوسکتی تھی؟ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ حضورؐ نے فرمایا امراض متعدی نہیں ہوتے۔ مترجم۔

مقابلہ ہے جن میں ایک بھی غلط بیان نہیں پایا جاتا۔ یہ بات واضح طور پر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات پر ان کی تعلیمات کے دو حصے ہو گئے تھے۔ اولاً ان کے ماننے والوں کی بڑی تعداد کو قرآن زبانی یاد تھا۔ کیونکہ ان کی طرح وہ بھی اسے بار بار پڑھتے اور دہراتے رہتے تھے۔ مزید برآں قرآنی متن کی ہاتھ سے لکھی ہوئی نقلیں موجود تھیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی سے تیار کی گئیں تھیں اور ہجرت سے بھی پہلے۔[1]

ثانیاً، آپؐ کے قریب ترین پیرو اور صحابہ جو آنؐ کے اقوال اور افعال کے عینی شاہد تھے انہوں نے ان اقوال و افعال کو یاد رکھا تھا۔ چنانچہ انھیں جب کوئی نیا مسئلہ درپیش ہوا تو قانون سازی کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے قرآن کے علاوہ پیغمبر کے قول و عمل کے بھی حوالے دیئے اور ان کا سہارا لیا۔

پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد کے سالوں میں ان کی دو قسم کی تعلیمات (قرآن اور حدیث۔ مترجم) کو الگ الگ طور پر مرتب کیا گیا۔ احادیث کا پہلا مجموعہ ہجرت کے تقریباً چالیس سال بعد تیار کیا گیا۔[2] جب کہ قرآن اس سے پہلے خلیفہ ابوبکرؓ کے زمانے میں جمع کیا جاچکا

---

[1] ہجرت کا واقعہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت سے دس سال پہلے ۶۲۲ء میں پیش آیا۔ مصنف

[2] فاضل مصنف کا یہ بیان درست نہیں کہ احادیث کا پہلا مجموعہ ہجرت کے چالیس سال بعد مرتب ہوا اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ حضورؐ کی حیات مبارکہ کے دوران ہی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوہریرہ اور حضرت سعد بن عبادہ کے مجموعہ ہائے احادیث مرتب ہو چکے تھے۔ خود خلیفہ اول حضرت ابوبکر نے ۵۰۰ احادیث پر مشتمل ایک مجموعہ تیار کیا تھا لیکن پھر اس خوف سے تلف کر دیا کہ مبادا اس میں کوئی غیر معتبر اور غیر مصدقہ حدیث شامل ہو گئی ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس متعدد مجموعے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے اپنا مجموعہ جو ایک ہزار احادیث پر مشتمل تھا رسولؐ اکرم کی اجازت سے تیار کیا تھا۔ اور اس کا نام الصادقہ رکھا تھا۔ بعد میں یہ مجموعہ ان کے پوتے عمرو بن شعیب کے قبضے میں آیا۔ حضرت امام حسن اور ابوموسیٰ اشعریؓ کے صحیفے سے اخذ کرکے

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

تھا، خاص کر خلیفہ عثمانؓ کے زمانے میں موخر الذکر نے اپنے عہدِ خلافت (۲۴ تا ۳۵ھ) میں قرآن کا قطعی متن مصحف کی صورت میں تیار کرا کر شائع کیا اور اہم اسلامی مراکز میں اس کی نقلیں بھیجیں۔

ان دو قسم کے متون (قرآن اور حدیث) میں ادبی نقطۂ نظر نیز ان کے مضامین و مافیہ کے لحاظ سے جو فرق پایا جاتا ہے اس پر زور دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کے اسلوب بیان کا احادیث کے مضامین کا جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں مقابلہ کیا جاتا ہے تو ان کے اختلافات پر حیرت ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں حسب ذیل نکات کو ثابت کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔

ایک طرف تو یہ کہ قرآن کے بیانات اکثر پیش پا افتادہ معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں ایسے حقائق و کوائف پنہاں ہوتے ہیں جنھیں بعد میں سائنس نے آشکار کیا۔

دوسری طرف یہ کہ احادیث کے بعض بیانات اپنے زمانے کے تصورات سے بالکل ہم آہنگ نظر آتے ہیں لیکن ان میں پائے جانے والے خیالات و آلات آج کل سائنسی نقطۂ نظر سے قابل تسلیم نہیں اور ایسے خیالات و آرا اسلامی عقیدہ اور قانون سازی کے متعلق مجموعی بیانات میں پائے جاتے ہیں جن کی صداقت بلاشک و اعتراض سب کو تسلیم ہے۔

(بقیہ حاشیہ) نے بھی اپنے مجموعے تیار کیے ہمام بن منبہ نے اپنا ایک صحیفہ ابو ہریرہؓ کے صحیفے سے اخذ کر کے مرتب کیا تھا۔ اس صحیفے کے چند قدیم نسخوں کا جو برلن اور دمشق کی لائبریریوں میں موجود ہیں مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے غائر مطالعہ و مقابلہ اور تحقیق و تدقیق کے بعد اسے دمشق سے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا اور حیدرآباد دکن سے اس کا اردو ترجمہ بھی ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق اور اس صحیفے کی اشاعت سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ احادیث کا ایک معتدبہ ذخیرہ خود عہد نبوی میں ہی احاطۂ تحریر میں آ چکا تھا۔ اور یہ سلسلہ خلفائے راشدین اور صحابہ کے عہد میں جاری رہا۔

احتیاط کی انتہا یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے طلبائے حدیث کو حکم دیا تھا کہ وہ کوئی حدیث بغیر اسناد کے نہ لکھیں۔ یہی طریقہ بعد میں اہل محدثین نے بھی اپنایا۔ مترجم

آخر میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رویہ قرآن کے بارے میں اس رویے سے بالکل مختلف تھا جو اپنے ذاتی اقوال کے بارے میں تھا۔ قرآن کے بارے میں تو انھوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ وحیٔ خداوندی ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بیس سال سے زائد عرصے کے دوران میں انھوں نے قران کی سورتوں کی انتہائی احتیاط سے ترتیب و درجہ بندی کی۔ قرآن وہ چیز تھا جسے انؐ کی زندگی ہی میں احاطۂ تحریر میں لانا، زبانی حفظ کرنا اور نمازوں و دعاؤں میں پڑھنا ضروری قرار دیا گیا۔ جب کہ احادیث کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اصولاً محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال اور ذاتی خیالات تفصیل بیان کرتی ہیں لیکن یہاں انھوںؐ نے دوسروں پر چھوڑ دی کہ احادیث میں مذکور انؐ کے قول و فعل میں اپنے کردار کے لیے نمونہ تلاش کریں اور جسے چاہیں انھیں لوگوں کے سامنے لائیں۔ پیغمبرؐ نے اس بارے میں کوئی ہدایات نہیں دیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ احادیث کی ایک محدود تعداد ہی کے متعلق یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیغمبرؐ کے خیالات کی حامل ہیں۔ دوسری احادیث میں ان کے زمانے کے دوسرے انسانوں کے خیالات پائے جاتے ہیں خاص کر ان مضامین کے متعلق جن کا بیان ذکر کیا گیا ہے۔ جب ان ضعیف یا غیر صحیح احادیث کا مقابلہ قرآن کی عبارت سے کیا جاتا ہے تو ہم ان کے اختلافات کے حدود حساب کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس مقابلے سے ایک بار پھر وہ حیرت انگیز فرق کھل کر سامنے آ جاتا ہے جو اس زمانے کی سائنسی نقطۂ نظر سے غلط بیانات سے معمور تحریروں اور اس قسم کی اغلاط سے پاک وحی و تنزیل کی کتاب مرقوم قرآن میں پایا جاتا ہے[1]۔

---

[1] مذہبی نقطۂ نظر سے احادیث کی صداقت شک و شبے سے بالاتر ہے لیکن جب وہ دنیاوی معاملات سے بحث کرتی ہیں تو پیغمبرؐ اور عام انسانوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ایک حدیث میں پیغمبرؐ کا ایک قول بیان کیا گیا ہے کہ "جب میں تمھیں کسی دینی معاملے سے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے بجا لاؤ لیکن اگر کوئی حکم اپنی ذاتی رائے سے دوں تو یاد رکھو کہ میں بھی ایک انسان ہی ہوں" سرخسی نے اپنی تصنیف "الاصول" میں اس حدیث کو یوں بیان کیا ہے: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

آخری عمومی نتائج

وہ ہمارے اس مطالعے وتحقیق کے آخر میں ایک حقیقت جو صاف طور پر کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آج کل جو کتب مقدسہ موجود ہیں' ان کے بارے میں اہلِ مغرب کی غالب رائے حقیقت پسندانہ نہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کن حالات' کن زمانوں میں اور کن طریقوں سے عہدنامہ عتیق اناجیل اور قرآن کے اجزا جمع کر کے احاطۂ تحریر میں لائے گئے ان سہ گانہ تنزیلات پر مبنی صحائف جن حالات میں معرض وجود میں آئے وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان کتب مقدسہ کے متون کی صحت اور ان کے مضامین کے بعض پہلوؤں پر اپنے نتیجہ خیز اثرات کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔

عہدنامہ عتیق کثیر التعداد ادبی تصانیف کی نمائندہ ہے جو تقریباً نو سو سال کے عرصے میں لکھی گئیں۔ یہ بے جوڑ عناصر کا بجرنگی مجموعہ ہے جس کے عناصر و اجزا میں کئی صدیوں کے دوران میں انسانی ہاتھوں نے تغیر و تبدل کیا۔ پہلے سے جو کچھ موجود تھا اس میں کچھ اجزا کا اضافہ کیا۔ آج یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ ان اجزا کی اصل کیا تھی اور وہ کہاں سے آئے یا پے گئے۔

اناجیل کا مقصد یہ تھا کہ مسیحؑ کے اقوال و افعال کی تفصیل بیان کر کے انسانوں کو ان تعلیمات سے روشناس کرایا جائے جو وہ (مسیحؑ) اپنے دنیاوی مشن کی تکمیل کے بعد انسانوں کے لیے

(بقیہ حاشیہ) "اگر میں تمہارے پاس تمہارے دین کے متعلق کوئی بات لاؤں تو اس پر عمل کرو۔ اور اگر میں اس دنیا کے بارے میں کوئی بات کہوں تو اپنے دنیاوی معاملات تو تم بہتر جانتے ہو۔" مصنف

چھوڑ جانا چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے اناجیل کے مصنفین ان حالات و واقعات کے عینی شاہد نہ تھے جو انھوں نے اپنی اپنی اناجیل میں درج کیے۔ وہ تو نمائندہ اور ترجمان تھے جنھوں نے محض وہ حالات و واقعات بیان کیے جو مختلف یہودی' عیسائی جماعتوں کی مسیحؑ پبلک زندگی کے متعلق جمع اور محفوظ کی ہوئی معلومات پر مبنی تھے۔ اور یہ معلومات زبانی روایتوں یا تحریروں جو زبانی روایت اور موجودہ قطعی متعین متنوں کی درمیانی کڑی تھیں لیکن اب ناپید ہیں' کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی چلی آئی تھیں۔

آج کل یہودی' عیسائی کتب مقدسہ کو اس روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ واقعیت پسندی کا تقاضا ہے کہ ماہرین تفسیر کے کلاسیکی تصورات کو اب ترک کر دیا جائے۔

ماخذوں کی کثرت و گوناگونی کا ناگزیر نتیجہ تضادات اور اختلافات کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ان تضادات و اختلافات کی متعدد مثالیں دی جا چکی ہیں۔ اناجیل کے مصنفین جب مسیحؑ کا ذکر کرتے ہیں تو ان میں بعض امور و واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا رجحان صاف ظاہر ہوتا ہے بعینہٖ جیسا کہ زمانۂ وسطی کے فرانسیسی شاعر اپنی بیانیہ نظموں میں کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ واقعات انفرادی نقطۂ نظر سے بیان کیے جاتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بیان کردہ واقعات کی صداقت بے حد مشتبہ ہو جاتی تھی۔ لہٰذا یہودی' عیسائی کتب مقدسہ میں جو چند بیانات جدید معلومات و انکشافات سے کچھ تعلق رکھنے والے پائے جاتے ہیں' ان کی مشکوک صداقت کے پیشِ نظر ان کی جانچ پرکھ بڑی احتیاط سے کرنی چاہیے۔

ہم نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے اس کی روشنی میں یہودی۔ عیسائی کتب مقدسہ کے بیانات کے جدید سائنس کے ساتھ تضادات' مستبعدات اور تباینات کی آسانی سے توجیہ کی جا سکتی ہے جدید مطالبات کے کھلے کھلے نتائج کو چھپانے اور ان پر پردہ ڈالنے کے لیے بہت سے سرکاری مفسرین اور شارحین نے معذرت خواہانہ شعریت سے بھرپور انداز میں ایسی مسلسل عیارانہ' منطقی اور مناظرانہ قلابازیاں اب تک لگائی ہیں اور ان کی دور رس مساعی کا نتیجہ یہ ہے کہ جب عیسائیوں کو بائبل اور سائنس کے تضادات کا احساس ہوتا ہے تو ان کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال مسیحؑ کے وہ نسب نامے ہیں جو متی اور لوقا کی انجیلوں

میں موجود ہیں جو باہم متضاد ہیں اور سائنسی نقطۂ نظر سے ناقابلِ تسلیم۔ یوحنا کی انجیل پر خصوصی توجہ دی گئی ہے کیونکہ اس میں اور باقی تینوں اناجیل میں بہت اہم اختلافات پائے جاتے ہیں، خاص کر یہ امر کہ انجیل یوحنا میں عشائے ربانی کی رسم کے انعقاد کا کوئی ذکر نہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ لوگ عام طور پر اس سے واقف نہیں۔

نزولِ قرآن کی اپنی تاریخ ہے جو یہودی۔عیسائی کتبِ مقدسہ سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یہ تقریباً بیس سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ جونہی قرآن کا کوئی حصہ فرشتۂ اعظم جبرئیل، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچاتا، اہلِ ایمان اسے زبانی یاد کر لیتے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں قرآن ضبطِ تحریر میں بھی لایا گیا تھا۔ آخری بار قرآن کے نسخہ ہائے مصحف تیسرے خلیفہ عثمانؓ (جو پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت کے بارہ سال بعد خلیفہ ہوئے اور بارہ سال تک رہے) کے عہدِ خلافت میں مدون و مرتب کیے گئے۔ ان کی صحت کی پڑتال ان اصحاب پیغمبرؐ نے کی جنھیں قرآن زبانی یاد تھا اور اس وقت سے یاد تھا جب اس کا نزول ہو رہا تھا اور تب سے وہ لگاتار اس کی تلاوت کرتے آئے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ تب سے قرآن کا متن بڑی حزم و احتیاط سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی صحت و استناد کے بارے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن اپنی دو پیشرو وحیوں (تورات و انجیل) کے برعکس نہ صرف تضاد بیانی سے پاک ہے جب کہ اناجیل میں مختلف انسانی ہاتھوں کی تحریف و تعریف کی علامات صاف موجود ہیں۔ بلکہ معروضی طور پر اور سائنس کی روشنی میں مطالعہ کرنے والوں پر اپنی یہ خصوصیت عیاں کر دیتا ہے کہ اس کے بیانات جدید سائنسی معلومات و کوائف سے کامل ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ مزید براں، جیسا کہ اس کتاب میں دکھایا گیا ہے، اس میں سائنسی موضوعات سے تعلق رکھنے والے بہت صحیح بیانات پائے جاتے ہیں اور یہ سوچا نہیں جا سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا کوئی آدمی ان کا مصنف ہو سکتا تھا۔ لہٰذا قرآن کی بعض آیات جن کی صحیح توجیہ و تشریح اب تک ناممکن تھی، جدید سائنسی معلومات کی روشنی میں انھیں سمجھنا ممکن ہو گیا ہے۔

ایک ہی موضوع پر بائبل اور قرآن کے متعدد بیانات کے باہمی مقابلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اول الذکر کے بیانات سائنسی نقطۂ نظر سے ناقابلِ تسلیم ہیں اور آخر الذکر کے

بیانات جدید معلومات سے پورے طور پر ہم آہنگ ہیں۔ لہٰذا دونوں میں بنیادی اختلافات ہیں، مثلاً تخلیق کائنات اور طوفانِ نوح کے بارے میں دونوں کے بیانات، جن کا ہم مفصل ذکر کر چکے ہیں خروج کی تاریخ سے متعلق بائبل کے بیان کا ایک بے حد اہم تکملہ قرآن مہیا کرتا ہے یعنی موسیٰؑ کا زمانہ متعین کرنے میں دونوں کے بیانات اثری انکشافات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر دوسرے موضوعات پر بائبل اور قرآن کے بیانات میں بڑے اختلافات ہیں۔ یہ اختلافات اس بلا دلیل و شہادت الزام کی تردید کرتے ہیں کہ قرآن کا متن تیار کرنے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے بائبل کی نقل کی۔

بعض احادیث کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن ان کی صحت مشکوک ہے (اگرچہ وہ اپنے زمانے کے اعتقادات کو ظاہر کرتی ہیں)۔ جب احادیث کے مجموعوں میں سائنسی مضامین سے متعلق موجود بیانات اور اسی نوعیت کے قرآنی بیانات کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان کا فرق اس قدر واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ دونوں کا ماخذ سرچشمہ ایک ہو ہی نہیں سکتا۔

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے انسانی علم کی سطح اور وسعت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ سائنسی موضوعات سے متعلق قرآن کے بیانات کا مصنف کوئی انسان ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہنا بالکل جائز، معقول اور صحیح ہے کہ قرآن نہ صرف وحی خداوندی ہے بلکہ اپنی صحت و استناد اور سائنسی مضامین، جن کا مطالعہ آج انسانی تشریح و توضیح کے لیے کھلا چیلنج ہے، کی بنا پر ایک بہت ہی خاص مقام کا مستحق ہے[1]۔

---

[1] نحن نزلنا الذکر ونحن له محافظون
("ہم (اللہ) ہی نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" (قرآن)
(مترجم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۝

اسلام کے حقیقی نظریات اور معارف کے ادراک اور آپ کے علمی، دینی اور روحانی ذوق کی تسکین کیلئے

عالم اسلام کے جید عالموں اور دانشوروں کی تحقیقی کاوشوں پر مبنی اور اپنے مواد کی صحت، دیدہ زیب کتابت عمدہ کاغذ اور خوبصورت طباعت سے مزین ہونے کی بنا پر مندرجہ ذیل مطبوعات کتابوں کی دنیا میں یقیناً گراں بہا اضافہ ہیں

توبہ دستغیب شیرازی	۱۵/=
تربیت اولاد مولانا جان علی شاہ کاظمی	۲۵/=
اولین موذن اسلام حضرت بلال سعید عین آبادی	۴/=
جناب فضہ رح راحت حسین ناصری	۷/=
مجالس عظیم مولانا سید کلب عابد صاحب	۲۵/=
سیرت امیر المومنین جلد (۱) مولانا مفتی جعفر حسین صاحب	۱۲۰/=
سیرت امیر المومنین جلد (۲) " " "	۷۵/=
الخلفاء (حصہ اول) فروغ کاظمی	۳۰/=
تفسیر کربلا " "	۶۰/=
درگاہ حضرت عباسؑ تاریخ کی روشنی میں (مرتبہ حسن لکھنوی)	۲۵/=
آل محمد کا دیوانہ بہلول دانا نرجس عابدہ	۲۰/=
عرفان امامت، حالات امام زمانہؑ ظفر عباس کشمیری	۷/=
البیان، تفسیر سورہ الحمد سید ابو القاسم الخوئی	۳۰/=
اہل ذکر ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی	۷۰/=
انتقام خونیں یا خروج مختار سید محمد علی انجوای	۸/=
اسلام اور جنسیات ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی	۲۰/=
کائنات روش مراثی باقر علی خاں روش لکھنوی	۲۰/=

تعقیبات نماز (پاکٹ سائز)	۵/=
اسلام اور عزاداری (مجموعہ مجالس کراچی) طاہر جرولی صاحب	۲۵/=
علوم القرآن مولانا سید محمد ہارون صاحب	۳۰/=
صرف ایک راستہ عبد الکریم مشتاق (پاکستان)	۷۰/=
قرآن اور جدید سائنس موریس بوکائی	۳۰/=
الخلفاء (حصہ دوم) فروغ کاظمی	زیر طبع
حضرت عائشہ کی تاریخی حیثیت فروغ کاظمی	"
قرآن اور سائنس مولانا سید کلب صادق صاحب	"
منازل آخرہ (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟) شیخ عباس قمی علیہ الرحمۃ	"
انوار (ہندی) مرتبہ ادیب الہندی صاحب	۱۲/=
راہنمایان اسلام (ہندی) مولانا سید علی نقی	۲۵/=
اسلام اور سیکس (ہندی) ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی	زیر طبع
قرآن مجید (ہندی) مولانا فرمان علی صاحب	"
نہج البلاغہ (ہندی) مولانا مفتی جعفر حسین صاحب	"
تفسیر کربلا (ہندی) فروغ کاظمی	"

ملنے کا پتہ

عباسؑ بک ایجنسی

درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ-۳